نیلی روشنی کا راز
PDFBOOKSFREE.PK

نیلی روشنی کا راز

بچوں کے لیے ناول

آفتاب احمد

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی مینگورہ پشاور حیدرآباد کراچی

دوسری بار 1970ء
تعداد 2500
قیمت 5=75

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور باہتمام عبدالحمید خاں پرنٹر و پبلشر
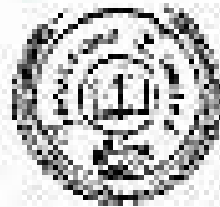
خطرناک روشنی

راول پنڈی چھاؤنی کے سرے پر کیپٹن ندیم احمد کا خوب صورت بنگلا تھا۔ کیپٹن ندیم کی عمر پچیس سال تھی۔ آج اپریل کی پہلی تاریخ تھی اور اس کے بنگلے میں بلال احمد کی سال گرہ منائی جا رہی تھی۔ بلال جو رشتے میں ندیم کا چچا لگتا تھا۔ عمر میں ندیم سے چار سال چھوٹا تھا۔ بلال اور ندیم کا گہرا دوست ضرار بھی آ چکا تھا۔ ہر چیز تیار تھی۔ تمام مہمان ہال میں جمع تھے اور ندیم، بلال اور ضرار کا انتظار کر رہے تھے۔

اتنے میں وہ تینوں ہال میں داخل ہوئے۔ مہمانوں نے تالیاں بجائیں جن کا جواب تینوں نے یوں ہاتھ ہلا ہلا کر دیا۔ جیسے وہ تینوں قومی رہنما ہیں۔

ندیم نے آتے ہی ایک میز پہ ہاتھ رکھ کر تقریر شروع کر دی:

خواتین و حضرات ۔

آج فسٹ اپریل ہے اور ہمارے چچا بلال نے جنم لینے
کے لیے آج کا دن ہی پسند کیا تھا ۔ گویا بلال کا پیدا ہو
بھی ایک مذاق ہے .... (تالیاں)

خواتین و حضرات ! یہ دن صرف اِسی لحاظ سے اہم نہیں
ہے کہ آج بلال کی سال گرہ ہے بلکہ اِس لحاظ سے بھی بڑ
مُبارک ہے کہ مسٹر بلال کو ہوا بازی کی تعلیم دینے والے
اُستادوں نے اِن کو ہوا بازی کے تمام اِمتحانوں میں نمایا
کام یابی کا خط بھی آج ہی بھیجا ہے ۔ (تالیاں)

میں بلال کو اپنی اور آپ سب کی طرف سے مُبارک
باد پیش کرتا ہُوں ۔ (تالیاں) اب سال گرہ کا کیک کاٹا
جاتا ہے ۔

کیک کاٹا گیا اور سب نے مل کر "ہیپی برتھ ڈے
ٹو یو" گایا ۔ کافی دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا ۔ گلی میں
سے ایک گدھے کے رینکنے کی آواز آئی تو بلال نے ایک
دم ضرار کی طرف مُڑ کر کہا ۔ "آپ نے کُچھ کہا ؟" اِس پ
زبردست قہقہہ پڑا اب آہستہ آہستہ سب لوگ واپس جا
رہے تھے ۔ ایک کونے میں شیخ صاحب اپنے ایک بُوڑھے
دوست سے باتیں کر رہے تھے ۔ بلال قریب سے گزر ر

تھا کہ اُس نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی کار کو اُلٹا چلاتے
ہُوئے بنگلے سے باہر لے جا رہا ہے ۔ بلال جھٹ بول
اُٹھا ۔ "دیکھیے شیخ صاحب ، کیا اُلٹا زمانہ آ گیا ہے ۔ اب
موٹریں اُلٹی چلنے لگی ہیں ۔" شیخ صاحب اور اُن کے بُوڑھے
دوست دیر تک ہنستے اور کھانستے ، کھانستے اور ہنستے رہے ۔

تقریباً سوا آٹھ بجے تک سب مہمان جا چکے تھے ۔
مہمانوں کے دِیے گئے تحفوں کو ضرار ، بلال اور کیپٹن ندیم
تینوں دیکھ رہے تھے ۔ اِتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔
ندیم لپک کر اپنے کمرے میں گیا ۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس
لوٹا تو اُس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر لکھا تھا ۔
462/9934..0048,0048 ۔ ندیم کے چہرے پر
سنجیدگی طاری تھی ۔

"کیا بات ہے کیپٹن ؟" بلال اور ضرار نے پُوچھا ۔

"کوئی ڈاکٹر صاحب ہیں جو اپنا نام سردش بتاتے ہیں ۔
مری کی طرف جائیں تو یہاں سے دس میل کے فاصلے پر
اُن کا بنگلا ہے ۔ اُنھوں نے مجھے ہندسوں میں ایک پیغام
لکھوایا ہے ۔ اِس کا مطلب ہے "زندگی خطرے میں ہے ۔
فوراً پہنچو ۔ فوراً پہنچو ۔"

"دراصل ہمارے کُنبے میں ایک مُدّت سے یہ رواج چلا

آ رہا ہے کہ جب کوئی لڑکی یا لڑکا پچیس سال کا ہوتا ہے
تو اُسے ہم آپس میں ایک دُوسرے کو پیغام دینے کے
لیے خُفیہ ہندسوں کی ایک فہرست رٹا دیتے ہیں اور اِس کا
اِستعمال ہمارے کُنبے کے لوگوں کے سِوا اور کوئی نہیں جانتا
چاچی کو تُم جانتے ہی ہو گے ضرار ؟ ان کا اصل نام
عبدُالعزیز ہے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کے پروفیسر
رہے ہیں ۔ میں بُہت چھوٹا سا تھا تو اُن کو چچا جی کے
بجائے چاچی کہتا تھا ۔ اُس وقت سے میں اُن کو چاچی ہی
کہتا ہُوں ۔ اُن کی زندگی خطرے میں ہے ۔ اگر معمُولی خطرہ ہوتا
تو میں کل صُبح یہاں سے روانہ ہوتا لیکن اب میں کسی
صُورت بھی نہیں رُک سکتا ۔ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ۔
تُم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ ۔"

ندیم اپنے کمرے میں گیا اور ریوالور نکال کر جیب
میں ڈال لیا ۔ ضرار اور بلال بھی تیار ہو چُکے تھے ۔ بلال
نے گاڑی بنگلے سے نکال لی تھی اور وُہ ڈرائیور کی سیٹ پر
بیٹھا ہُوا تھا ۔ ندیم اور ضرار کُود کر کار میں جا بیٹھے ۔
گھرر ر ـــ گھرر ر ـــ شُوں ۔ اور گاڑی مری کی طرف جانے
والی سڑک پر دوڑنے لگی ۔ ندیم بولا :

ضرار ، میں تمھیں چاچی کا ذرا تفصیل سے تعارُف کراتا

ہُوں ۔ تمھیں آج تک اُن سے مُلاقات کا موقع اِس لیے نہیں
مل سکا کہ چاچی سیلانی طبیعت کے اِنسان ہیں ۔ اکثر وطن
سے باہر سیر و سیاحت میں وقت گُزارتے ہیں ۔ میں خُود
دو سال کے بعد اُن سے ملنے جا رہا ہُوں ۔ غالب اور اقبال
کے ہزاروں شعر اُنھیں یاد ہیں ۔ یہ میرے حقیقی چچا نہیں
بلکہ میرے والد صاحب کے بچپن کے دوست ہیں ۔ اِن کا
ہمارے کُنبے کے ساتھ اِس قِسم کا برتاؤ رہا ہے کہ اب ہم
اِنھیں رشتے داروں سے کہیں زیادہ عزیز رکھتے ہیں ۔

راول پنڈی سے مری کی طرف جائیں تو 25 میل کے
فاصلے پر دائیں ہاتھ کو ایک چھوٹی سی سڑک پُھوٹتی ہے ۔
اِس سڑک پر دس میل چلنے کے بعد ایک بستی ہے جس کا
نام فردوس ہے ۔ یہاں زیادہ تر افسروں کے بنگلے ہیں ۔
اِنھی میں سے ایک بنگلا چاچی کا ہے جس کا نام جنّت نگاہ
ہے ۔ فردوس میں ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہے اور آب و
ہَوا بے حد فرحت بخش ہے ۔"

گاڑی پُوری رفتار سے جا رہی تھی ۔ سات میل... آٹھ
میل ... نو میل ... اور دس میل ۔

"اِس طرف ..... اُس نیلے بنگلے میں ۔" ندیم نے بلال
سے کہا ۔

"شوں.... کھٹک" اور گاڑی ڈاکٹر سروش کے بنگلے کے سامنے ٹھہر گئی۔ بلال نے ہارن بجایا اور ڈاکٹر سروش ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑے باہر آئے۔

ندیم نے اپنا تعارف کرایا۔ تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں پھر ڈاکٹر صاحب نے لفافہ ندیم کو دے دیا۔ خدا حافظ کہہ کر تینوں گاڑی میں بیٹھے ———— اور گاڑی مری کی طرف جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

ندیم نے لفافہ کھولا۔ اُس میں لکھا تھا:

محترم کیپٹن ندیم صاحب!

پروفیسر صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ جب فردوس میں داخل ہوں تو احتیاط برتیے۔ "جنّتِ نگاہ" کے گرد عجیب قسم کی مخلوق منڈلا رہی ہے۔ اگر نیلی روشنی نظر آئے تو اس سے بچیے۔ یہ بے حد خطرناک ہے۔ باقی باتیں ملاقات پر معلوم ہوں گی۔

آپ کا آصف

"یہ آصف کون ہے؟" فرّار نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" ندیم نے مختصر سا جواب دیا۔

گاڑی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ فردوس میں داخل ہو گئے۔ ایک پختہ سڑک جس کی لمبائی

ایک ہزار گز ہو گی سیدھی جنّت نگاہ پر جا کر ختم ہوتی تھی اب گاڑی اس سڑک پر آ چکی تھی۔

"بریک لگاؤ" ندیم زور سے چلّایا اور اُس کے ساتھ ہی گاڑی ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ راستے میں ایک درخت سڑک کے آر پار گرا ہُوا تھا۔ اگر گاڑی اِس سے ٹکرا جاتی تو اُنھیں شدید چوٹیں آتیں۔ گاڑی درخت سے فقط چار اِنچ پرے رُک گئی تھی۔ تینوں گاڑی سے اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

"وُہ.... وُہ دیکھو... نیلی روشنی" ضرار چلّایا۔

اُن سے پچاس گز کے فاصلے پر نیلی روشنی کا ایک بادل سا آہستہ آہستہ اُن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ندیم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا اور نیلے بادل کا نشانہ لینے لگا۔ "ٹھا ٹھا" اُس نے دو فائر کر دیے اور جب تیسرا فائر کرنے لگا تو اِس بادل سے ایک نیلی کرن نکلی اور ندیم کے ہاتھ پر پڑی۔ ندیم زمین پر گر گیا۔ اُس کا ہاتھ سُن ہو چکا تھا اور ریوالور دُور جا گرا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ندیم ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ "کیپٹن ہوش میں آؤ۔" ضرار نے ندیم کا بازو جھٹکتے ہوئے کہا اور دُوسرے ہی لمحے ندیم کھڑا ہو گیا۔

"بھاگو۔ ضرار، بلال بھاگو۔ نیلی روشنی سے بچو۔ اِس طرف آؤ میرے پیچھے۔" اور تینوں درختوں کے ایک جُھنڈ کی طرف بھاگے۔ اُنھیں سر پَیر کا کوئی ہوش نہ تھا۔ راستے میں ضرار نے کہا:

"ہماری کار کا کیا بنے گا؟"

"لعنت بھیجو کار پر۔ اس وقت جان بچاؤ" ندیم نے جواب دیا —

ہانپتے کانپتے وُہ کوٹھی کے لان میں داخل ہو گئے اندر باہر کی تمام بتّیاں بُجھی ہُوئی تھیں اور دروازے بھی اندر سے بند تھے۔

"اِدھر آؤ بلال، اِس دیوار کی طرف مُنہ کر کے اور اِس پر ہاتھ ٹیک کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمھارے کندھوں پر کھڑے ہو کر اس کھڑکی کا شیشہ توڑتا ہُوں۔"

ندیم نے کھڑکی کا شیشہ توڑا اور کمرے میں کُود گیا۔ پھر اُس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور تینوں کمرے میں داخل ہو گئے۔ ندیم نے سگریٹ لائٹر جلایا۔

"اُف میرے اللہ" ندیم نے کہا۔ "کمرہ تو اسلحہ خانہ معلوم ہوتا ہے۔ وُہ ٹیبل لیمپ تو ذرا جلانا۔" ضرار نے لپک کر لیمپ جلا دیا۔ ندیم بولا:

"یہ رہی ہاتھی مارنے والی بندوق۔ اِس الماری میں دو بندوقیں اور کارتوسوں کی پیٹیاں ہیں۔ یہ بارہ بور کی دو نالی بندوق ہے۔ ضرار یہ تم لے لو۔ یہ پستول میں اپنے لیے رکھتا ہوں۔ بلال تم بھی اپنی پسند کی بندوق لے لو اوہ ! یاد آیا۔ دروازہ تو ہم کھلا چھوڑ آئے ہیں ــ جانا ضرار۔"

اچانک کوٹھی کے لان میں سے کسی کی خوف ناک چیخ سُنائی دی۔ تینوں دروازے کی طرف بڑھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک نیلا بادل کسی شخص کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ شخص اندھیرے میں ایک سایہ سا معلوم ہوتا تھا اور چیختا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"شوٹ کر دو۔ شوٹ کر دو" وہ شخص چلّایا۔

ضرار نے بغیر سوچے سمجھے نیلے بادل کے درمیانی حصّے پر دو فائر کر دیے۔ ٹھا ٹھا دونوں گولیاں نیلے بادل میں جا کر لگیں۔ بادل نے ایک جھرجھری لی اور پھر غائب ہو گیا۔

اندھیرے میں بھاگنے والا شخص اب کوٹھی کے دروازہ کے قریب آگیا تھا۔ "ٹھہرو، کون ہو تم؟ ہینڈز اَپ" ندیم چلّایا۔

سایہ ٹھہر گیا۔ اُس نے ہاتھ بلند کیے اور کہا۔ "میں ... میں آصف ہوں۔"

"کون آصف؟ ہم کسی آصف واصف کو نہیں جانتے۔" ندیم نے ڈانٹ کر کہا۔

"مجھے قریب آنے کا موقع دیں۔ میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں۔" سایہ بولا۔

ندیم نے اسی طرح رُعب دار آواز میں کہا۔ "اگر تم شرارت کی نیّت سے آئے ہو تو واپس چلے جاؤ۔ ورنہ ہماری گولیاں تمھارا جسم چھلنی کر دیں گی۔"

"نہیں نہیں۔ میں آپ کا دوست ہوں۔" سایہ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

وہ شخص دروازے میں داخل ہو چکا تھا۔ اُس نے تینوں سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ "میں پروفیسر عبدُالعزیز کے مرحوم دوست کا لڑکا آصف ہوں۔ میرے والد ریاست حیدرآباد کے ایک نوّاب تھے۔ میں پروفیسر عبدُالعزیز کے ہاں ہی رہتا ہوں۔ میں نے ہی آپ کو ڈاکٹر سروش کے ہاں پیغام بھیجا تھا اور ......"

"یہ کیا گڑبڑ ہے؟" پروفیسر عبدُالعزیز سیڑھیاں اُترتے ہوئے بولے۔

"السّلامُ علیکُم چاچی" ندیم نے گردن گھُما کر پروفیسر کو سلام کیا۔

"میں کمرے میں لیٹا ہُوا تھا کہ گولی چلنے کی آواز آئی۔ یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ آؤ اُوپر میرے کمرے میں چلو۔ وہاں چل کر باتیں ہوں گی۔"

اُوپر جا کر چاچی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ ندیم اور آصف قریب ہی کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بلال اور ضرّار بھی ذرا پرے کھڑکیوں کے قریب کُرسیوں پر بیٹھ گئے۔

"باہر کا دھیان رکھنا" ندیم نے بلال اور ضرّار سے کہا۔

"فکر نہ کرو کیپٹن" اُنھوں نے جواب دیا۔

"آصف بیٹے، تُم اِن کے لیے کافی تیّار کرو" پروفیسر نے کہا اور آصف کافی تیّار کرنے چلا گیا۔

"بھئی ندیم، تُم کہتے ہو گے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے میں تمھیں ابھی بتائے دیتا ہُوں۔ لیکن ٹھہرو پہلے تھوڑا سا تعارُف ہو جائے اور پھر میں بتاؤں گا کہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ سچ پُوچھو تو ندیم بیٹے، زندگی کے بارے میں یہ مصرع کِسی نے بالکُل ٹھیک کہا ہے"

"کون سا مصرع چاچی؟" ندیم نے پُوچھا۔

پروفیسر نے گلا صاف کرتے ہُوئے کہا:

ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی

"چاچی ذرا اِس کا مطلب بھی بتا دیجیے" بلال کھڑکی کے قریب سے بولا۔

"کون ہے یہ؟ بلال! ارے شریر، مجھے یاد ہے تُو میری تُرکی ٹوپی کے پُھندنے میں کانٹا اُڑس کر ٹوپی کھینچ کر بھاگ جایا کرتا تھا — اِدھر آ شیطان۔ کتنا بڑا ہو گیا ہے۔"

چاچی نے بلال کو پیار کیا۔

"چاچی اِس مصرعے کا مطلب کیا ہے؟" بلال نے پھر پُوچھا۔

"ہاں اِس کا مطلب ہے بیٹا کہ خطروں میں رہ کر زندگی گُزارنے کا نام ہی زندگی ہے .... اور یہ دُوسرے صاحب کون ہیں؟"

"چاچی، اِس کا نام ہے داستان گو" ندیم نے کہا۔

"داستان گو؟ — یہ کیا نام ہُوا بھلا؟" پروفیسر نے پُوچھا۔

"دراصل میرا نام ضرّار ہے۔ کیپٹن مجھے داستان گو کہا کرتے ہیں۔ حالاں کہ اب میں نے داستانیں سُنانی چھوڑ دی ہیں" ضرّار بولا۔

"چچا جان، کافی تیّار ہے۔" آصف نے برتنوں کو میز پر سجاتے ہُوئے کہا۔ اُس نے ہر ایک کے آگے کافی کی ایک ایک پیالی رکھ دی۔ ندیم نے فرّار کا تعارُف کرایا۔ پھر چاچی نے حسبِ عادت ایک دو شعر پڑھے اور آصف کا تعارُف کرانے لگے۔

چاچی کا قصّہ

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے تُم حیران ہو گے کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور میں نے تمھیں یہاں کِس مقصد کے لیے بُلایا ہے۔" چاچی نے کہا۔" تو میں تمھیں پُورا قِصّہ سُناتا ہُوں۔ ندیم، تمھیں یاد ہوگا کہ ہم دو سال پہلے مِلے تھے۔"

"جی ہاں۔ اِس دوران میں آپ کہاں رہے۔ بتائے بغیر ہی غائب ہو گئے۔" ندیم نے پُوچھا۔

چاچی بولے: "اُس وقت تُم مشرقی افریقہ کی مُہم پر جا رہے تھے اور میں چین جانا چاہتا تھا۔ دراصل چین ایک ایسا مُلک ہے جس کی تاریخ، چیزوں اور باشندوں سے مجھے ہمیشہ ہی دِل چسپی رہی ہے۔ تو ہاں، میں چین جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے سفر کے لیے تمام ضروری چیزوں کا اِنتظام کر لیا تھا کہ روانگی سے دو دِن پہلے میرے ایک مرحُوم دوست نوّاب اِبراہیم بہادر کا اکلوتا لڑکا

نوّاب آصف میرے پاس آیا۔ نوّاب ابراہیم حیدرآباد دکن
کے رہنے والے تھے، مگر پاکستان بننے سے دو سال پہلے
راول پنڈی چلے آئے تھے۔ انھوں نے اپنا روپیہ پیسہ
بھی یہیں منگوا لیا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد ساری جائداد
اُن کی اکلوتی اولاد نوّاب آصف کو ملی اور یہ نوّاب آصف
وہی ہیں جن کے ہاتھ سے تم نے ابھی کافی پی ہے۔"
سب نے گھوم کر آصف کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا
رہا تھا۔

چاچی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "آصف میڈیکل کالج
لاہور میں پڑھتا تھا۔ اُسے جڑی بوٹیوں کے بارے میں جاننے
کا بہت شوق تھا۔ اُس نے ایک بہت شان دار لیبارٹری
بنائی تھی جس میں وہ دن رات جڑی بوٹیوں پر تجربے کیا
کرتا تھا۔ ایک دن اُسے معلوم ہوا کہ چین میں ایک خاص
قسم کی بوٹی پائی جاتی ہے جو برص کے مرض کے لیے بہت
مفید ہے۔ آصف میرے پاس آیا اور مجھ سے درخواست
کی کہ میں اُسے بھی اپنے ساتھ چین لیتا چلوں۔ میں مان
گیا اور ہم دونوں چین چلے گئے۔

"دو ماہ کے سفر کے بعد ہم چین کے مغربی حصّے
تبّت کے قریب پہنچ گئے۔ تبّت کا رقبہ تو بہت بڑا ہے

مگر اُس کی آبادی بہت کم ہے۔ یہ علاقہ سمندر کی سطح سے
13 ہزار سے لے کر 16 ہزار فٹ تک بلند ہے۔

"اِنھی دنوں ہم نے سنا کہ تبّت میں ایک پہاڑ ہے۔
جس میں سے روشنی نکلتی ہے اور وہاں کے لوگ اُسے
"کوہِ نور" یعنی روشنی کا پہاڑ کہتے ہیں۔ اِس کے بارے میں
اور بھی عجیب و غریب باتیں سننے میں آئیں۔ مثلاً یہ کہ جو
لوگ اِس پہاڑ کے قریب رہتے ہیں وہ کبھی بیمار نہیں پڑتے
اور وہ عمر بھی بہت لمبی پاتے ہیں۔ پہلے تو ہمیں اِن باتوں
کا یقین نہ آیا مگر جب تبّت کے ہر حصّے میں یہی باتیں
سننے میں آئیں اور بعض پڑھے لکھے لوگوں سے بھی سنا تو
ہمیں شوق ہوا کہ "کوہِ نور" کو خود اپنی آنکھوں سے جا کر
دیکھنا چاہیے۔ قصّہ مختصر ہم وہاں پہنچ گئے۔ بس یہیں سے
ہماری مصیبتوں کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

"دراصل روشنی کے اِس پہاڑ کی چند ایسے پُراسرار لوگ
حفاظت کر رہے ہیں جن کے خلاف ہم کچھ نہیں کر سکتے۔
ہمیں جو جو عجیب و غریب واقعات پیش آئے اگر میں اِن
سب کو بیان کرنے لگوں تو کئی دن صرف ہو جائیں گے۔
بس یوں سمجھ لو کہ ہمیں اِس قدر خطروں کا سامنا کرنا پڑا
کہ آخرکار ہم نے پاکستان لوٹ آنے کا ارادہ کر لیا۔ ہمارا

خیال تھا کہ اب ہم اِن خطروں سے بچ نکلے ہیں لیکن افسوس
اُن لوگوں کی تسلّی نہ ہُوئی اور ...."

" لوگ ؟ — کون سے لوگ ؟" ندیم نے پُوچھا۔

"وہی لوگ جو روشنی کے اُس پہاڑ کی حفاظت کر رہے
ہیں اور جو اب تک ہمارے پیچھے لگے ہُوئے ہیں ۔" چاچی
نے کہا۔

" لیکن اب تو آپ اُس پہاڑ سے سینکڑوں میل دُور
ہیں اور پھر آپ نے اِن لوگوں کو کوئی نُقصان بھی نہیں
پہنچایا۔ پھر یہ لوگ آپ کا پیچھا کیوں کر رہے ہیں ؟
ندیم نے پُوچھا۔

چاچی نے جواب دیا ۔" ہمارا قصُور صِرف اِتنا ہے کہ
ہمیں یہ معلُوم ہو گیا ہے کہ دُنیا میں روشنی کا کوئی پہاڑ
بھی ہے اور یہ لوگ نہیں چاہتے کہ کِسی شخص کو اِس پہاڑ
کے بارے میں کچھ معلُوم ہو ۔"

" اِس کا مطلب تو یہ ہُوا کہ یہ کوئی پُر اسرار پہاڑ ہے

" بالکل ٹھیک ۔" چاچی بولے ۔" میرا بھی یہی خیال ہے
کہ اِس پہاڑ میں ضرُور کوئی بھید ہے ۔"

" اچھا پھر کیا ہُوا ؟ " ضرار نے پُوچھا۔

" ہاں ۔" چاچی بولے ۔" پھر ہم تبّت سے بھاگے اور

راستے میں برف باری سے بچنے کی کوشش میں راستہ بھول
گئے ۔ چند دِن بعد ہم پاکستان کے بجائے جاپان پہنچ گئے
تھے ۔ جاپانی اخباروں میں ہمارے بارے میں ایک خبر چھپی
تو اس پہاڑ کے رکھوالوں کو ہمارا پتا چل گیا ۔ اب وُہ پھر
ہمارا پیچھا کرنے لگے ۔ میں تمھیں کیسے بتاؤں کہ اللہ نے ہمیں
کِس کِس طرح موت کے مُنہ سے بچایا ۔"

" چاچی ، اِنھیں اُن دو بدنصیب شخصوں کا واقعہ سُنائیے
جو ہماری وجہ سے مارے گئے ۔" آصف نے کہا ۔

چاچی بولے ۔" بات دراصل یہ ہُوئی کہ جاپان پہنچ کر
ہم ایک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے جو لوگوں سے کھچا کھچ
بھرا ہُوا تھا ۔ ایک شام وہاں دو مُسافِر آئے جو تھکن سے
چُور تھے ۔ ہم نے اپنا کمرہ ان کو دے دِیا اور ہم خُود
دُوسری جگہ چلے گئے ۔ صُبح ہُوئی تو پتا چلا کہ دونوں مُسافِر
رات کے وقت ہلاک کر دِیے گئے ۔ ان کے جسم پر زخم
وغیرہ کا کوئی نشان نہ تھا ۔ لوگ حیران تھے کہ اُنھیں کیا
ہُوا ؟ لیکن ہمیں پتا تھا کہ ان کو کِس نے ہلاک کیا ہے ۔"

" میرے اللہ " ندیم کے مُنہ سے نِکلا ۔" کِس قدر ظالِم
اور خطرناک ہیں یہ لوگ ۔"

" اب میں تمھیں سب سے خطرناک واقعہ سُناتا ہُوں ۔"

چاچی نے کہا ۔ "جاپان سے ہم ایک بحری جہاز میں سوار ہُوئے ۔ ہم نے سوچا تھا کہ اب ہماری مُصیبتیں ختم ہو گئیں مگر یہ ہماری بھول تھی ۔ ہم نے اپنی سیٹیں ذرا دیر سے ریزرو کروائی تھیں اس لیے ہمیں دو سیٹوں والا ایک چھوٹا سا کمرہ مِلا ۔ ہم تھکے ہُوئے تھے اس لیے آصف تو شام ہوتے ہی سو گیا ۔ میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ کمرے میں پڑے ہُوئے صندُوق کا ڈھکن آہستہ آہستہ اُونچا ہو رہا ہے ۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید مجھے دھوکا ہُوا ہے ۔ جلدی سے آنکھیں ملیں ۔ پھر دیکھا تو ڈھکن آدھے سے زیادہ کُھل چکا تھا ۔ مجھے پُورا یقین ہو گیا کہ صندُوق کے اندر ضرور کوئی شخص موجُود ہے ـــــ صندُوق کے ڈھکن خُود بخُود کبھی نہیں کُھلتے ۔ میں فوراً اُٹھ بیٹھا اور پستول نکال کر ہاتھ میں تھام لیا ۔ پھر میں نے آصف کو جھنجھوڑا ۔ وُہ بھی اُٹھ کھڑا ہُوا ۔ میں نے اُسے ساری بات سمجھائی ۔ ہماری حرکتوں کو صندُوق میں موجُود شخص نے دیکھ لیا تھا ۔ اچانک صندُوق کا ڈھکن پھر بند ہو گیا اور دھم کی سی آواز آئی ۔ اِس آواز کو میں نے اور آصف دونوں نے سُنا ۔ میں اُچھل کر صندُوق کے اُوپر جا بیٹھا اور ڈھکن کو اپنے بوجھ سے نیچے دبائے رکھا ۔ آصف ٹیلی فون کر

کے جہاز میں موجُود پولیس افسر کو بُلا لایا ۔ اُس نے صندُوق میں چُھپے ہُوئے شخص کو باہر آنے کے لیے کہا مگر اندر سے کوئی جواب نہ مِلا ۔ اِس پر پولیس افسر نے صندُوق کھول دیا ۔"

"اہم اہم ۔" چاچی نے کھانستے ہُوئے کہا ۔ "آپ لوگ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ صندُوق خالی تھا ۔ خالی سے میری مُراد یہ ہے کہ اِس میں کوئی آدمی نہ تھا مگر ایک تیز دھار کا خنجر اور ایک بوتل اس کے اندر پڑی تھی ۔"

"یہ آپ خواب سُنا رہے ہیں نا چاچی ؟" ندیم نے پُوچھا ۔

"نہیں بیٹے ۔ مجھے پہلے ہی خیال آیا تھا کہ تُم اِسے خواب کہو گے ۔ یہ بالکُل سچّا واقعہ ہے ۔ اب ذرا آگے سُنو میری حالت عجیب تھی ۔ ایک تو میں اِس واقعے پر حیران ہو رہا تھا ۔ دُوسرے پولیس افسر مُجھے عجیب نظروں سے گُھور رہا تھا ۔ اُس نے سمجھا شاید میں مذاق کر رہا ہُوں ۔

"پھر اچانک مُجھے خیال آیا کہ یہ صندُوق تو ہمارا ہے ہی نہیں ۔ میرا صندُوق تو میری سیٹ کے نیچے دھرا تھا اور آصف کا ٹرنک دِیوار کے ساتھ لگا ہُوا تھا ۔ میں نے پولیس افسر سے کہا کہ یہ صندُوق نہ تو میرا ہے اور نہ

آصف کا۔ اِس لیے میں اسے اپنے کمرے میں رکھنے کے
لیے ہرگز تیار نہیں ہُوں۔

"آفیسر نے صندُوق کو اُلٹ پُلٹ کر دیکھا تو اُس کی
نچلی طرف چینی یا جاپانی زبان میں کھُدا ہُوا ایک لفظ نظر
آیا۔ لیکن ہم نے اس کی طرف کوئی توجّہ نہ دی۔ افسر
نے ایک مُلازِم کو بُلایا اور اپنے ہاتھ سے اِس صندُوق
میں تالا لگا کر اس کے گرد رسی لپیٹی اور اُوپر کی منزل
میں لے گیا۔ یہ خالی صندُوق اِتنا وزنی تھا کہ مُلازِم اور
افسر اُسے بڑی مُشکل سے اُٹھا سکے۔ ہم حیران تھے کہ خالی
صندُوق اِتنا بھاری کیسے ہو سکتا ہے۔

"خیر، وقت گُزرنے کے ساتھ ساتھ ہم اِس صندُوق
کو بھی بھُول گئے۔ راستے میں طُوفان آ گیا اور ہمارے جہاز
کو کچھ نقصان پہنچا۔ ایک ہفتے تک اِس کی مرمّت ہوتی
رہی اور پھر دو ہفتے بعد ہم کراچی پہنچے۔

"جب سارا سامان اُتار لیا گیا تو اِس صندُوق کو لینے
کے لیے کوئی بھی نہ آیا۔ آخر کسٹم والوں نے میری موجُودگی
میں اس کا تالا کھولا تو دیکھا کہ اِس میں تبّت کے ایک
شخص کی لاش ہے۔"

"لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ یہ صندُوق خالی

تھا۔" ندیم نے حیرت سے کہا۔

"ہاں اُس وقت وُہ واقعی خالی تھا۔" چاچی نے جواب
دیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی وقت میں کوئی چیز ہو
بھی اور نہ بھی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ ایک ہی وقت میں
صندُوق خالی بھی ہو اور پھر اُس میں آدمی بھی ہو۔" ندیم
نے کہا۔

"تمھاری بات بالکُل ٹھیک ہے۔ اسی بات پر تو ہم
خُود حیران ہیں۔ میں تو صرف وُہ واقعات ہی بتا رہا ہُوں
جو ہمیں پیش آئے۔"

"کیا آپ کو سَو فی صد یقین ہے کہ یہ صندُوق وہی تھا
جو آپ کے کمرے میں تھا؟" ندیم نے پُوچھا۔

"بالکُل۔ اِس کا ایک ثبُوت تو یہ ہے کہ اِس میں وہی
تالا لگا ہُوا تھا جو پولیس افسر نے ہماری موجُودگی میں لگایا
تھا۔ دُوسرا ثبُوت یہ ہے کہ اِس کے نیچے چینی یا جاپانی
زبان کا وہی لفظ کھُدا ہُوا تھا۔" چاچی بولے۔

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے چاچی۔" ندیم نے کہا۔ "وُہ
آدمی اِس تالے لگے صندُوق میں مچھّر بن کر گھُس گیا تھا
یا چیونٹی بن کر۔"

"یہی بات تو ہے" چاچی بولے "جس پر ہم سب
حیران ہیں ۔ لیکن پہلے تم میری بات، کو مکمل ہو لینے
دو ــــ"

"یعنی ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے ؟" ندیم نے پوچھا ۔

" ہاں ۔ ابھی بات پوری نہیں ہوئی بلکہ اس سے بھی
بدتر حصّہ تو اب آنے والا ہے ۔ پھر ہم گھر آ گئے ۔ اور
کچھ دن خیریّت سے گزر گئے ۔ میں نے اور آصف نے
پھر نقشے کھول لیے "

" چین کے دوبارہ سفر کے لیے ؟ " ندیم نے پوچھا ۔

" ہاں ۔ دوبارہ سفر کے لیے ۔ لیکن تم درمیان میں مت
بولو ــ" چاچی نے کہا " دو دن پہلے کی بات ہے کہ میں
نقشے کھولے یہاں بیٹھا ہوا تھا اور آصف چہل قدمی کے
لیے باہر گیا ہوا تھا ۔ احتیاط کے طور پر اس نے رائفل
بھی ساتھ رکھ لی تھی ۔ اچانک مجھے خطرے کا احساس
ہوا ۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی شخص کمرے میں گھس آیا ہے ۔
میں ایک دم کھڑا ہو گیا ۔ پہلے میں نے سوچا ، شاید یہ
میرا وہم ہو لیکن پھر کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر نیلے
رنگ کے بادل سے ملتا جلتا ایک ٹکڑا کھڑا ہے ۔ پھر
اچانک اس میں سے نیلے رنگ کی ایک شعاع نکلی اور

سیدھی میری طرف بڑھی ۔ جونہی وہ میرے جسم سے ٹکرائی ۔
مجھے یوں معلوم ہوا جیسے ہتھوڑا آن لگا ہے اور ساتھ ہی
مجھے نیند آنے لگی ۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے میرے جسم
پر فالج گر چکا ہے ۔ میں نے چیخنا چاہا مگر آواز میرے
حلق میں اٹک کر رہ گئی ۔ بازو اٹھانے چاہے مگر وہ
من من بھر کے ہو چکے تھے ۔ میں سمجھ گیا کہ میری موت
کا وقت آن پہنچا ہے لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا
اسی لمحے آصف کمرے میں داخل ہوا ۔ پھر مجھے معلوم نہیں
کہ کیا ہوا ۔ میں بے ہوش ہو چکا تھا ۔

"جب میں ہوش میں آیا تو آصف سے پتا چلا کہ جب
وہ سیر کر کے واپس لوٹا تو اس نے گھر کے دروازے
پر ایک نیلے رنگ کا بادل دیکھا ۔ اس بادل کے اندر
انسان سے ملتا جلتا ایک سایہ تھا ۔ آصف نے اس پر
فائر کر دیا ۔ اس پر وہ نیلا بادل بھاگ اٹھا اور نظروں
سے غائب ہو گیا ۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ
جب آصف اس جگہ پہنچا جہاں بادل کھڑا تھا تو کیا دیکھتا
ہے کہ وہاں سے لے کر باہر کی طرف خون کے قطروں
کی ایک لکیر سی بن گئی ہے "

" ہاں خون کے قطروں کی ایک لکیر ۔ میں نے ایک قطرہ

اُٹھا کر اس کا اِمتحان کیا تو وُہ اِنسانی خُون نکلا۔ اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ نیلے بادل میں ضرور کوئی اِنسان تھا۔" آصف نے کہا۔

"واقعی؟" یہ سُن کر ندیم اُچھل پڑا۔

"اِتنی خُوشی کی کیا بات ہے؟" چاچی نے پُوچھا۔

ندیم نے جوش سے کہا۔ "جس چیز سے خُون نکل سکتا ہے وُہ جان دار ہوتی ہے اور آصف صاحب نے بھی کہا ہے کہ وُہ خُون اِنسانی تھا۔ یقیناً اس نیلے بادل میں کوئی اِنسان ہی تھا۔ میں بعد میں کُچھ بتاؤں گا۔ پہلے آصف صاحب آپ یہ بتائیں کہ اس کے بعد کیا ہُوا۔"

آصف بولا۔ "سچ پُوچھیے تو میں خوف زدہ ہو گیا تھا عجیب عجیب واقعات پیش آ رہے تھے نیلی شعاع کے لگنے کے بعد چاچی بے ہوش ہو چکے تھے میں اُنھیں ہوش میں لے تو آیا مگر وُہ کم زور ہو گئے تھے۔ اب سب کُچھ مُجھ اکیلے کو ہی کرنا پڑتا تھا۔

"ہمارے بنگلے کے قریب ہی ایک ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں۔ میں ان کے ہاں چاچی کے لِیے دوائی لینے گیا ہُوا تھا۔ وہاں مُجھے مسٹر سروش ملے۔ میڈیکل کالج میں وُہ میرے بہترین دوست رہ چُکے ہیں۔ وُہ کِسی کام کی غرض سے اِس ڈاکٹر کے پاس آئے ہُوئے تھے اور شام کو

واپس گھر جا رہے تھے۔ میں اُنھیں چاچی سے مِلانے کے لِیے یہاں لے آیا۔ اچانک، چاچی کو آپ کا خیال آیا۔ اُنھوں نے سوچا آپ سے مدد لی جائے۔ میں کاغذ پنسل لے آیا اور اُنھوں نے خُفیہ ہندسوں میں ایک رُقعہ مسٹر سروش کو دیا۔ میں نے بھی ایک خط مسٹر سروش کے حوالے کر دیا۔ اور کہا کہ خط کِسی اور کے ہاتھ نہ لگے۔

"میں نے سروش سے کہا تھا کہ تُم پہلے فُون پر بات کرنا اور ہندسوں کا پیغام ندیم صاحب تک پہنچا دینا۔

"خُوش قسمتی سے اُنھوں نے فُون کیا تو آپ مِل گئے۔ اور خط لینے کے لِیے سروش کے ہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر سروش کو ہم نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ ندیم چھ فُٹ کا لمبا تڑنگا ہنس مُکھ نوجوان ہے۔ اُس نے آپ کا حُلیہ دیکھ کر پہچان لیا اور خط آپ کے حوالے کر دیا۔"

سروش صاحب یہ پیغام خود لے کر میرے بنگلے پر کیوں نہیں آئے؟" ندیم نے سوال کیا۔

"دراصل چاچی کو آپ کے بنگلے کا نمبر اور سڑک کا نام بُھول گیا تھا۔ اُنھیں صِرف ٹیلی فُون نمبر یاد تھا۔" آصف نے کہا۔

"اچھّا اچھّا۔" ندیم نے کہا۔ "کل کوئی اور واقعہ تو پیش

نہیں آیا ؟"

"ہاں ۔" آصف نے کہا ۔" کل شام میں چہل قدمی کر کے واپس آ رہا تھا کہ ایک جگہ نیلے بادل نے مجھ پر نیلی شعاع پھینکی ۔ میں جان بچانے کے لیے گھر کی طرف بھاگا لیکن شعاع میرے ہاتھ پر پڑی اور مجھے یُوں لگا جیسے میرے جسم میں بجلی کا کرنٹ داخل ہو گیا ہے ۔ میرا ہاتھ بے جان ہو گیا مگر اللہ کا شکر ہے کہ جان بچ گئی ۔"

"بالکل ایسا ہی واقعہ آج مجھے بھی پیش آیا ۔" ندیم نے کہا ۔" جب ہم آ رہے تھے تو راستے میں یہی نیلا بادل ہماری طرف بڑھا ۔ میں نے گولی چلانے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ ایک شعاع ہاتھ پہ لگی ۔ ایسا لگا گویا میرے ہاتھ پہ فالج گر گیا ہے ۔ ریوالور گر کر پرے جا گرا اور ہم تینوں بھاگ اُٹھے ۔ شعاع کیا تھی بس ہتھوڑا تھی ــــ"

"بالکل صحیح کہا آپ نے واقعی ہتھوڑا تھی ۔" آصف نے کہا ۔

"اچھا ، اب یہ بتائیے کہ اِس سے بچنے کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے ؟" ندیم نے پُوچھا ۔

چاچی بولے ۔" میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ پہلے

سوچا تھا کہ یہ مکان چھوڑ دُوں ۔ لیکن یہ وحشی وہاں بھی آ جائیں گے ۔"

"وحشی ؟" ندیم نے بات کاٹ کر کہا ۔" یہ لوگ جنھوں نے موت کی شعاع ایجاد کی ہے اور لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں ، آپ کی نظر میں وحشی ہیں ؟"

"نظروں سے غائب ہونا ؟ ــــ کیا مطلب ہے تمھارا ؟" چاچی نے حیران ہو کر پُوچھا ۔

ندیم بولا ۔" مطلب صاف ہے ۔ یعنی وُہ تبتی جس کی لاش آپ کے بتائے ہُوئے ٹرنک سے نکلی تھی ۔ سفر کے دوران میں ٹرنک میں ہی رہا لیکن آپ لوگ اُسے نہ دیکھ سکے ۔ وُہ خنجر اُس نے آپ کے قتل کے لیے رکھا ہُوا تھا اور وُہ بوتل جو صندوق میں تھی اس میں کوئی ایسا پانی یا دَوا تھی جسے تبتی لوگ پی کر نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں ۔"

"یہی وجہ تھی کہ جب جہاز کے افسر اور مُلازِم نے ٹرنک اُٹھایا تو وُہ بھاری معلُوم ہُوا ۔ دراصل اُس وقت ٹرنک میں وہ تبتی موجُود تھا لیکن نظر نہیں آ رہا تھا ۔"

"پھر جب افسر نے تالا لگا دیا تو کئی دنوں تک صندوق میں بند رہنے اور روٹی پانی نہ ملنے کی وجہ سے وُہ مر

گیا۔ اب دَوا کا اثر ختم ہو چکا تھا اِس لیے وُہ پھر دکھائی
دینے لگا۔"

"تمہارا خیال دُرست معلوم ہوتا ہے۔" چاچی نے کہا۔
"میرے ذہن میں بھی اِسی طرح کے خیال آ رہے تھے۔
یہ لوگ ہمارا پیچھا کوہِ نُور سے کر رہے ہیں۔ کوہِ نُور یعنی
روشنی کا پہاڑ۔ ذرا سوچو تو پہاڑ میں سے روشنی کیوں کر
نِکل سکتی ہے؟ — ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اِس
پہاڑ میں بُہت زیادہ ریڈیم دھات موجُود ہو اور تُم جانتے
ہو ریڈیم دھات دُنیا میں سب سے زیادہ مہنگی دھات
ہے۔ اِس سے بے شُمار بیماریوں کا عِلاج کیا جا سکتا ہے
چنے کے ایک دانے کے برابر ریڈیم کی قیمت لاکھوں روپوں
کی ہوتی ہے اور ......"

وُہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ دروازے پر دستک
ہُوئی۔ ندیم نے بِلال اور فرّار کو اِشارہ کیا۔ تینوں اُٹھے
اور سیڑھیاں اُترتے ہُوئے نچلی منزل میں آ گئے۔ پہلے
اُنھوں نے ہتھیار دُرست کیے تاکہ اگر کوئی خطرناک دُشمن
ہو تو اُسے حملے سے پہلے ہی ختم کر دیا جائے۔ پھر ندیم
نے ایک دم دروازہ کھولتے ہُوئے کہا:

"آپ اندر آ سکتے ہیں۔"

دروازے پر ایک پولیس انسپکٹر اور ایک سپاہی کھڑا تھا۔
وُہ دونوں کمرے میں داخل ہُوئے تو فرّار اور بِلال بندوقیں
تانے کھڑے تھے۔

"یہ کیا؟" انسپکٹر نے حیرت سے کہا۔

"ہا ہا ہا۔" ندیم نے ہنستے ہُوئے کہا۔ "ہم سمجھے تھے۔
شاید ہمارا کوئی دوست ہو گا۔"

"تو آپ لوگ دوستوں کی آؤ بھگت اِسی طرح کیا کرتے
ہیں؟" انسپکٹر بولا۔

"کبھی کبھی مذاق میں یُوں بھی ہو جاتا ہے۔" ندیم نے
کہا۔ "فرمائیے کیسے تشریف لائے۔"

انسپکٹر نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔ "ابھی
تھوڑی دیر پہلے اِس بنگلے کے قریب ہی پارک میں ایک
شخص کی لاش مِلی ہے۔ معلُوم نہیں ہو سکا کہ یہ شخص کون
ہے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ لاش کِس کی ہو سکتی ہے؟"

"لاش؟" ندیم بُڑبُڑایا۔ "کِس کی لاش؟"

"کیا خُوب۔" انسپکٹر نے بھاری آواز میں کہا۔ "یہی تو
ہم آپ سے پُوچھنا چاہتے ہیں۔ ویسے یہ شخص کہیں اور مُلک
کا رہنے والا معلُوم ہوتا ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ
اُس کا جسم بالکُل ننگا ہے۔"

"اُس کی موت کیسے واقع ہُوئی ؟" ندیم نے پُوچھا۔
انسپکٹر نے ضرار کی بندُوق کی طرف اِشارہ کرتے ہُوئے کہا۔" بالکُل اِس قِسم کی بندُوق کی گولی لگنے سے۔"

یہ سُن کر ضرار کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ندیم نے اُس کی طرف مُڑ کر دیکھا اور آنکھ سے اِشارہ کرتے ہُوئے کہا:
" حوصلہ رکھو۔"

" لاش کا آپ کو کِس طرح پتا چلا ؟" ندیم نے پُوچھا۔
انسپکٹر بولا۔" ہمارا ایک سپاہی تھانے کی طرف آ رہا تھا کہ اُسے ٹھوکر لگی اُس نے ٹارچ جلائی تو وہاں لاش پڑی تھی ۔۔۔"

"اب وُہ لاش کہاں ہے ؟" ندیم نے پُوچھا۔

"مُردہ خانے میں" سپاہی بولا۔

"تُم خاموش رہو۔" انسپکٹر نے سپاہی سے کہا اور پھر ندیم سے بولا۔" آپ لوگوں نے ہی فائرنگ کی تھی ؟"

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ فائرنگ ہم نے کی تھی ؟" ندیم نے پُوچھا۔

" ہمارا سپاہی اِدھر سے گُزر رہا تھا۔ اُس کا اندازہ ہے کہ آواز اِسی طرف سے آئی تھی۔" انسپکٹر نے کہا۔

" لیکن اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔" ندیم نے کہا۔

انسپکٹر صاحب دو تین دِن سے اِس علاقے میں پہاڑی لوگ گھوم رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اُن میں سے کِسی نے اپنے ساتھی کو ہلاک کر دِیا ہو۔"

کُچھ دیر اور باتیں ہوتی رہیں اور پھر انسپکٹر چلا گیا۔

ندیم ضرار سے بولا:

"یہ وہی بادل والا آدمی ہے اور اسے تم نے ہی گولی مار کر ہلاک کیا ہے۔"

" ہاں کیپٹن۔" ضرار نے کہا۔" میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اگر اُسے گولی نہ مارتا تو آصف کی جان کو خطرہ تھا۔"

تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے اُوپر آ کر چاچی کو سارا قِصّہ بتایا۔ کُچھ دیر بعد ندیم نے جمائی لیتے ہُوئے کہا۔" چاچی میں تو اب تھک چُکا ہُوں۔ اب آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں ؟"

"بھئی سچ پُوچھو تو بات یہ ہے کہ میں تبّت واپس جاؤں گا اور سارے معاملے کا پتا کر کے رہوں گا۔" چاچی نے کہا۔

" چاچی۔" ندیم بولا۔" کہیں آپ کا یہ خیال تو نہیں کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں ؟"

"تم ٹھیک سمجھے ہو۔" چاچی مسکرا کر بولے۔
"یہ بہت خطرناک سفر ہوگا۔ ویسے تو ہم سب چاہتے
ہیں کہ کوہِ نور کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں مگر آپ کو پتا
ہے کہ اِس مہم میں ہمارا کتنا روپیہ خرچ ہوگا؟"
"بے شمار روپیہ خرچ ہو سکتا ہے" چاچی بولے۔ "لیکن
ہم اِس مہم پر جائیں گے ضرور۔"
"روپے کی آپ فکر نہ کریں۔ سارا خرچ میں برداشت
کروں گا۔" آصف نے مسکرا کر کہا۔
"تو گویا آپ بھی چاچی سے ملے ہوئے ہیں۔"
"بالکل۔" آصف نے مسکرا کر جواب دیا۔
ندیم، ضرار اور بلال چین جانے کے لیے تیار ہو گئے
چاچی اور آصف کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔
ندیم نے بتایا کہ انھیں ایک ہوائی جہاز خریدنا ہوگا۔
اِس پر آصف نے پوچھا کہ کس قسم کا جہاز؟
ندیم بولا۔ "ہمیں جس قسم کا جہاز چاہیے اُسے اُردو
میں جل تھلومی اور انگریزی میں ایمفی بئین (AMPHIBIAN)
کہتے ہیں۔ یہ ایسا ہوائی جہاز ہوتا ہے جسے خشکی اور پانی
دونوں پہ اُتارا جا سکتا ہے۔ نہایت شان دار جہاز ہے۔
مگر ہے بہت قیمتی۔"

"اندازاً کتنے روپوں میں آ جائے گا؟" آصف نے پوچھا۔
"اور ہمارے آنے جانے پر کتنا خرچ ہوگا؟"
ندیم نے جہاز، پٹرول اور دوسری چیزوں کی فہرست بنائی
اور تھوڑی دیر حساب کرنے کے بعد کہا۔ "تقریباً چار لاکھ
روپے خرچ ہوں گے۔"
آصف کے لیے چار لاکھ روپے کی رقم ایسے ہی تھی۔
جیسے چار سو روپے کہہ دی ہو۔ وہ کروڑ پتی باپ کا بیٹا
تھا۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا:
"میرے والد مرحوم کی نصیحت تھی کہ میں اِن کی دولت
کو انسانوں کی خدمت کے لیے صرف کروں۔ مجھے اِس سفر
سے انسانوں کی خدمت کا موقع ملے گا۔ کوہِ نور سے ریڈیم
مل جائے تو اِس سے ہم سرطان کی بیماری میں مبتلا لاکھوں
غریب انسانوں کا مفت علاج کریں گے۔"
اب رات کافی بیت چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ
سب سو گئے۔

تبت کا سفر

ندیم، چچا جی، قرار، بلال اور آصف نے تبت کے سفر کے لیے زور شور سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اُنھوں نے ضروری چیزیں راول پنڈی سے خریدیں اور پھر کراچی چلے گئے۔ کراچی میں وُہ ایک عام سے ہوٹل میں ٹھہرے کیوں کہ وُہ اپنی ہر بات کو خفیہ رکھنا چاہتے تھے۔

کراچی آئے ہُوئے اُنھیں چار ہفتے گزر چکے تھے۔ کیپٹن ندیم نے ہَوائی جہاز بنانے والی ایک مشہور کمپنی سے خط و کتابت اور ٹیلی فون کے ذریعے ایک جہاز خرید لیا تھا۔ یہ دو انجنوں والا جہاز تمام کا تمام دھات کا بنا ہُوا تھا اور اِس کا نام اُنھوں نے "شاہین" رکھا تھا۔
آخر وُہ مبارک وقت آ گیا جب وُہ تبت کی مُہم پر روانہ ہونے کے لیے جہاز کے اندر بیٹھے۔ سب نے

دُعائیں مانگیں۔ ندیم نے شاہین کو سٹارٹ کیا۔ کراچی سے اُڑتے ہُوئے وُہ بھارت کے علاقے پر سے گزرے اور چٹاگانگ کے ہَوائی اڈّے پر پہنچے۔
چٹاگانگ میں اُنھوں نے ایک عُمدہ ہوٹل میں اپنا سامان اُتارا۔ ندیم نے کاغذی کارروائیوں کو شام تک مکمل کر لیا۔ شام کے وقت وُہ سب ہوٹل میں بیٹھے بحث کر رہے تھے۔ ندیم کہہ رہا تھا:
"سب سے مُشکل بات یہ ہے کہ ہمیں پتا نہیں کہ ہمیں کہاں اُترنا ہے۔ خُدا معلُوم یہ نیلا پہاڑ یہاں سے کتنی دُور ہے۔ ایسی صُورت میں سفر بے حد خطرناک ہُوا کرتا ہے۔"
چچا جی نے کہا: "میں نے کوہِ نور کی طرف جانے والے راستے کے نقشے بڑی احتیاط سے بنائے ہیں۔"
آخر اُن نقشوں کو پھر نکالا گیا۔ ایک جگہ پہاڑیوں میں گھرے ہُوئے نقشے پر "کوہِ نور" لکھا ہُوا تھا۔ ندیم اس نقشے کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر ندیم اور چچا جی دیر تک بحث کرتے رہے۔ آخر ندیم نے کچھ گراف پیپر لیے اور اُن پر اپنے سفر کا راستہ بنانے لگا۔
پھر اُنھوں نے "شاہین" میں پٹرول بھرا اور چند ڈرم

پٹرول کے اپنے ساتھ رکھ لیے تاکہ اگر وُہ 'کوہِ نور' تک نہ پہنچ سکے اور کسی غلط راستے پر پڑ گئے تو واپس آنے کے لیے اُن کے پاس کافی پٹرول موجود ہونا چاہیے۔

"اب ہم کوہِ نور کس وقت روانہ ہو رہے ہیں؟" آصف نے پوچھا۔

"کل صُبح دس بجے"۔ ندیم نے جواب دیا۔

"ہمارا کُل سفر کتنا ہو گا؟" ضرار نے پوچھا۔

"آٹھ دس گھنٹوں کا یا زیادہ" ندیم نے جواب دیا۔

"کیا جہاز کے انجن بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں؟" چچاجی نے پوچھا۔

"سو فی صد" ندیم بولا۔

پھر انھوں نے چائے منگوائی۔ تھوڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور پھر سب سو گئے۔

صُبح سویرے اُٹھ کر انھوں نے غُسل کیا، کپڑے پہنے اور ناشتے سے فارغ ہو کر جہاز میں جا بیٹھے۔ ندیم نے انجن سٹارٹ کیا اور شاہین کو نیلے آسمان میں لے گیا۔

راستے میں دریائے گنگا بھورے رنگ کے دھاگے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وُہ پہاڑوں سے ڈھکی ہُوئی چوٹیوں پر سے گزر رہے تھے۔ راستے میں انھوں نے

مختلف جگہیں دیکھیں۔ آگے اُونچی اُونچی چوٹیاں شروع ہو
گئیں۔ ندیم کو ڈر ہُوا کہ کہیں اُن کا جہاز ٹکرا نہ جائے۔
وُہ جہاز کو اور اُونچا لے گیا اور وُہ آہستہ آہستہ سمُندر کی
سطح سے سولہ ہزار فٹ کی بُلندی پر اُڑنے لگا۔

"مجھے ایک سموسہ دینا فرّار" ندیم نے کہا اور فرّار
نے اُسے سموسہ تھما دیا۔

"پانچ بج گئے ہیں" چاچی نے گھڑی دیکھ کر بڑبڑاتے
ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

ندیم نے جہاز کی رفتار کچھ اور تیز کر دی تھی۔ وُہ
سمُندر کی سطح سے سولہ ہزار فٹ اُونچے اُڑ رہے تھے۔
مگر پہاڑ اُن سے صرف ایک ہزار فٹ نیچے تھے۔

اچانک پہاڑیوں کا ایک سلسلہ شروع ہُوا جن کی
چوٹیاں نوکیلی تھیں۔ تمام پہاڑیاں ویران تھیں میلوں تک
کوئی اِنسان، مکان، چرند پرند کچھ نظر نہ آتا تھا۔

وُہ حیران تھے کہ اگر کوہِ نُور یہیں کہیں ہے تو اِس
کے بارے میں پُوچھیں گے کس سے؟ کیپٹن ندیم اپنی
جگہ سے اُٹھا اور فرّار، چاچی اور آصف کے پاس بیٹھ
گیا اب جہاز کو بلال چلا رہا تھا۔

"میرے خیال میں ہمیں اب جہاز کو کچھ دیر کے لیے

زمین پر اُتار لینا چاہیے" ندیم نے چاچی سے کہا۔

"جیسا تم مُناسب سمجھو" چاچی نے کہا۔

ندیم نے گردن گھما کر بلال کی طرف دیکھا۔ وُہ کچھ پریشان
نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" ندیم نے پُوچھا۔ "گھبرائے ہُوئے کیوں"

"یہ جہاز کے اِنجنوں میں سے آوازیں کیسی آ رہی ہیں؟"
بلال نے کہا۔

ندیم اُٹھ کر واپس اندر والے کمرے میں چلا گیا اور غور
سے سُوئیوں کو دیکھا۔ دونوں سُوئیاں نیچے گر رہی تھیں۔
جیسے اِنجن خراب ہو گئے ہوں۔ ندیم بھی پریشان ہو گیا۔
اب اِنجنوں میں سے گھر گھر کی آوازیں اور بُلند ہو گئیں
تھیں۔ یُوں معلُوم ہوتا تھا جیسے وُہ کچھ دُور اور گئے تو
دونوں اِنجن بند ہو جائیں گے۔

"بلال" ندیم نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"آگے جانے میں خطرہ ہے۔ یہیں کہیں اُترنے کا
بندوبست کرو"

اِنجن آہستہ آہستہ بند ہو رہے تھے اور اِن میں سے
اُٹھتا ہُوا شور بہت بُلند ہو گیا تھا۔ سب ڈر گئے۔

"میرے خیال میں وُہ جگہ ٹھیک رہے گی" بلال

نے اُنگلی سے اِشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" ندیم نے جواب دیا۔

بلال نے ایک چکّر لگایا اور بڑی ہوشیاری سے پہاڑیوں کے درمیان درختوں کے ایک لمبے چوڑے جھنڈ میں جہاز اُتار لیا۔ سب لوگ جہاز سے باہر آ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔

کوہِ نور

کیپٹن ندیم، بلال، ضرّار، چاچی اور آصف گھاس پر کھڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

"اب کیا کریں؟" چاچی نے پُوچھا۔

"جہاز کی ٹنکی میں پٹرول ختم ہو چکا ہے" ندیم بولا۔ "سب سے پہلے ہم چاروں خالی ٹنکیوں میں پٹرول بھریں گے۔ میں اور بلال اِنجنوں کو چیک کریں گے اور پھر سب کھانا کھائیں گے"

چاروں نے مل کر پٹرول نکالا اور بڑی اِحتیاط سے جہاز میں بھرنے لگے۔ بلال اور ندیم اِنجن چیک کرنے لگے اور ضرّار اور آصف نے جہاز سے خیمہ نکال کر زمین پر اچھی طرح سے گاڑ دیا۔ پھر اُنھوں نے قالین نکال کر بچھا دیا۔ کھانا گرم کیا اور سب کھانے لگے۔

کھانا کھاتے ہُوئے چاچی نے کہا: "جہاز میں کوئی نقص

ہے ؟"

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا" ندیم نے جواب دیا ۔ کہ آخر یکایک انجنوں کو ہو کیا گیا ہے ۔ جب ہم کراچی سے چلے تھے تو میں نے خود ایک ایک پرزے کو چیک کیا تھا ۔ چٹاگانگ سے یہاں تک سارا راستہ جہاز ٹھیک چلتا رہا ۔ بلال اور میں نے اُسے پھر چیک کیا ہے مگر ہمیں تو انجنوں میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی ۔"

"سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دونوں انجن ایک ساتھ خراب ہوئے ہیں" بلال نے کہا ۔

"بالکل ۔ میں خود یہی سوچ رہا ہوں" ندیم نے کہا "اگر ایک انجن خراب ہوتا تو میں سوچتا کہ شاید اس میں کوئی خرابی ہو گئی ہے ۔ لیکن اِس پہاڑی کے نزدیک پہنچتے ہی دونوں گھر گھر کرنے لگے ۔ ہماری قسمت اچھی تھی جو اُسے صحیح وقت پر زمین پر اُتار لائے ۔ ورنہ ہو سکتا ہے کوئی حادثہ پیش آ جاتا ۔ کیا اُس پہاڑ کا تو اِس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا جس کی تلاش میں ہم یہاں تک آئے ہیں ؟"

"کیا مطلب ؟" بلال نے پوچھا ۔

"میرا مطلب ہے" ندیم نے کہا ۔ "اُس پہاڑ میں

سے نکلنے والی نیلی شعاعوں کی وجہ سے تو انجنوں میں گڑبڑ نہیں ہوئی ؟"

"کیسی باتیں کرتے ہو" بلال بولا ۔

"بھئی ایسا ممکن تو ہے" چاچا جی نے کہا ۔

"خیر اِس کے بارے میں بھی سوچیں گے" ندیم نے کہا ۔ "پہلے کھانے سے تو فارغ ہو لیں ۔"

اُنھوں نے جلدی جلدی سے کھانا ختم کیا ۔ برتن تھیلے میں رکھے اور پھر قالین پر آ کر بیٹھ گئے ۔ ضرار نے کہا ۔ "میں جہاز میں آٹھ گھنٹے بیٹھے رہنے کی وجہ سے تنگ آ گیا ہوں ۔ اِس لیے چہل قدمی کے لیے سامنے والی ندی کے پاس جا رہا ہوں ۔ اُس کے ہاتھ میں ایک خالی ڈبا تھا جسے اُس نے پانی سے بھر لیا اور پھر وُہ کافی دُور نکل گیا ۔ تھوڑی دیر بعد ندیم نے اُسے آواز دی کہ واپس آ جاؤ ۔ جب وُہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں سفید رنگ کی ایک گندی سی چیز تھی ۔ جسے اُس نے زمین پر پھینک دیا ۔ سب اُسے غور سے دیکھنے لگے ۔

"یہ کیا ہے ؟ چاچا جی نے پوچھا اور پھر خود ہی بولے ۔ اوہ یہ تو کن کھجورا ہے ۔ اُف ، اتنا بڑا کن کھجورا میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ۔"

"عجیب قسم کا کن کھجورا ہے۔" ضرار بولا۔ "اُس کی جلد
مینڈک کی طرح اور پیٹ مچھلی کا سا ہے۔ مُنہ شارک مچھلی
سے مِلتا جُلتا ہے اور دانت اندر کی طرف مُڑے ہُوئے ہیں۔"
"گدھے، اِس قِسم کی بے کار چیزیں مت لاؤ۔" ندیم
نے ناراض ہوتے ہُوئے ضرار سے کہا۔
"تو پھر کِس قِسم کی چیزیں لاؤں؟" ضرار نے کہا اور ندیم
کی ہنسی نِکل گئی۔ ضرار نے ہاتھ میں پکڑی ہُوئی نوکیلی چھُری
کن کھجورے کے پیٹ میں بھونک دی اور اُس کے پیٹ
سے سُرخ رنگ کے خُون کی دھار بہنے لگی۔ پھر وُہ اِس طرح
سُکڑ گیا جیسے ہَوا نِکل جانے پر غُبارہ سُکڑ جاتا ہے۔
چاچی نے یہ دیکھ کر غُصّے سے کہا: "ضرار، اِسے دفن
کرو۔ یہاں سے کِس قدر بدبُو ہے اِس کے جِسم میں۔" اُنھوں
نے جیب سے رُومال نِکال کر ناک پر رکھ لیا۔ ضرار نے
چھُری کی نوک سے کن کھجورا اُٹھا کر پرے پھینک دیا۔
اندھیرا چھا رہا تھا اور سردی بہت تھی۔ ندیم نے کہا
کہ اگر تھوڑی دیر سیر کر لی جائے تو جِسم میں چُستی آ جائے
گی۔ سب نے ندیم کی بات مان لی اور وُہ چلنے کے لِیے
تیّار ہو گئے۔
اُن کے پاس ایک بارہ بور کی دو نالی بندوق، ایک

ریوالور اور ایک رائفل تھی۔ اُنھوں نے گولیاں بھریں اور
پھر سیر کے لِیے چل پڑے۔
"میرے اللہ" چاچی نے کہا۔ "دُور دُور تک کوئی چرند
پرند نظر نہیں آتا۔ عجیب پہاڑیاں ہیں یہ۔"
ندیم نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "چاند ابھی نہیں
نِکلا۔ اُف! ستارے کِس قدر خُوب صُورت معلُوم ہوتے ہیں۔"
"ہاں" آصف نے کہا۔
"ارے" ندیم نے کہا اور چلتے چلتے ایک دم ٹھہر گیا۔
"کیا بات ہے؟" چاچی نے پُوچھا۔
"وُہ پہاڑی دیکھتے ہیں آپ؟" ندیم نے اِشارہ کر کے
کہا۔ "دیکھیے اس پہاڑی کے چاروں طرف کِس قدر خُوب
صُورت روشنی پھیلی ہُوئی ہے۔"
سب غور سے اُسی طرف دیکھنے لگے۔ کافی دُور ایک
پہاڑی پر سے نیلے رنگ کی روشنی نِکل رہی تھی۔ یہ روشنی
ستاروں کی طرح لگاتار نہیں تھی بلکہ جلتی بُجھتی تھی۔
"اُف میرے اللہ" چاچی نے کہا۔ "ایسی خُوب صُورت
روشنی میں نے عُمر بھر نہیں دیکھی لیکن اس کی رنگت نیلی کیوں
ہے؟"
"میرے خیال میں یہ شمالی روشنی ہے۔" ضرار نے کہا۔ "کیا

خیال ہے آپ کا کیپٹن ؟"

ندیم کسی گہری سوچ میں تھا۔ کہنے لگا: "میرے خیال میں تو یہ وُہی پہاڑ ہے جس کی تلاش میں ہم نکلے ہیں۔"

"ہائیں" چاچی کے مُنہ سے حیرت سے نکلا اور پھر سب ندیم کا مُنہ تکنے لگے۔

"یقین نہیں آتا...... لیکن...... لیکن" چاچی نے کچھ کہنا چاہا مگر آواز نہ نکل سکی۔

تھوڑی دیر بعد ندیم بولا: "میں چند منٹ میں آپ کو بتا دُوں گا کہ یہ کوہِ نُور ہے یا کوئی اور پہاڑ۔"

"وُہ کیسے ؟" چاچی نے پُوچھا۔

"میں اِس سامنے والی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ کر دیکھوں گا ___"

"میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہُوں" چاچی نے کہا۔

"اور میں بھی چلوں گا" فرّار نے کہا۔

"ہم سب چلتے ہیں" ندیم نے کہا۔

اِن کے قریب ہی ایک پہاڑی تھی۔ سب اُسی کی طرف چلنے لگے۔ وُہ سمجھتے تھے کہ چوٹی قریب ہی ہے مگر وُہ ان کے اندازے سے دُور نکلی۔ آخر وُہ اِس چوٹی پر چڑھ گئے اب وُہ اس روشنی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یہ روشنی نیلے

رنگ کی تھی، اور قریب ہی ایک پہاڑی سے نکل رہی تھی۔ نیلی شُعاعیں آسمان کی جانب چاروں طرف پھیل رہی تھیں۔ اِن کی چمک اِتنی زیادہ تھی کہ اُن کو اپنی آنکھوں کے آگے ہاتھ رکھنا پڑے۔

"یہ وُہی کوہِ نُور ہے" ندیم نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" چاچی بولے: "اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ اِس پہاڑی میں اِتنی ریڈیم موجُود ہے کہ اس کا مالک ساری دُنیا کو خرید سکتا ہے"

"اور اگر چاہے تو اِس ریڈیم سے ساری دُنیا کے مریضوں کا علاج کر سکتا ہے" آصف نے کہا۔

"تم کیا کر رہے ہو؟" چاچی نے پُوچھا۔

"یہ میرے پاس قُطب نُما ہے۔ میں اِس پہاڑی کی سَمت معلُوم کر رہا ہُوں کیوں کہ کل صُبح جب ہم واپس یہاں آئیں گے تو دِن ہونے کی وجہ سے اِس پہاڑی میں سے روشنی نہیں نکل رہی ہو گی۔ اِس طرح اُسے ڈھونڈنے میں مُشکل پیش آ سکتی ہے" ندیم نے جواب دیا۔

"بہت خُوب" چاچی نے خُوش ہوتے ہُوئے کہا۔

"کیپٹن، یہ پہاڑی یہاں سے کتنی دُور ہو گی؟" آصف نے پُوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا" ندیم نے جواب دیا۔ "لیکن میرا
اندازہ ہے کہ چار میل سے کم اور سات میل سے زیادہ دُور
نہیں ہو سکتی۔"

اِس کے بعد وہ آدھ گھنٹے وہاں بیٹھے۔ کوہِ نُور کی خُوب
صُورت نیلی روشنی کو دیکھتے رہے۔ سردی زیادہ ہو گئی تھی
اِس لیے وہ واپس خیمے کی طرف چل پڑے۔

"میرے خیال میں آج ہم نے بُہت سا کام کر لیا ہے"
ندیم بولا۔ "سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جس پہاڑی
کی ہمیں تلاش تھی وہ ہم نے ڈھونڈ لی ہے۔ اِنشاء اللہ
کل ہم اِس پہاڑی پر کھڑے ہوں گے۔"

"کھڑے ہوں گے؟" ضرار نے حیران ہو کر کہا۔ "کیا
ہم پیدل وہاں جائیں گے؟"

ندیم نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم جہاز میں وہاں نہیں
جا سکتے۔ کیوں کہ پہاڑی کے ریڈیم سے نکلنے والی شعاعوں
کی وجہ سے ہی ہمارے جہاز کے اچھّے بھلے اِنجن بند ہُوئے
تھے۔ خیر یہ تو کل ہی پتا چلے گا۔ اگر ہمارا جہاز کل نہ
اُڑ سکا تو پھر پیدل وہاں جانا ہو گا۔ بہر حال جب یہاں
تک آ پہنچے ہیں تو پھر کچھ نہ کچھ ریڈیم لے کر ہی اب
پاکستان لوٹیں گے۔ اب رات کافی ہو چکی ہے۔ ہمیں

سونے کی تیاری کرنا چاہیے۔"

وہ خیمے تک پہنچ چکے تھے۔ اُنھوں نے بستر بچھائے
اور ایک دُوسرے کو شب بخیر کہہ کر سو گئے۔

سفید بلا

دُوسرے دِن صُبح کو اُٹھ کر اُنھوں نے قریب کی ندی پر ہاتھ مُنہ دھویا اور واپس آ کر ناشتا کیا۔ ندیم "شاہین" کے کاک پٹ (وُہ جگہ جہاں جہاز کا پائیلٹ بیٹھ کر جہاز چلاتا ہے) میں چلا گیا اور اِنجن سٹارٹ کرنے لگا۔ بلال اور ضرار نے "شاہین" کی دُم کو نیچا کیے رکھا۔ تاکہ جہاز چلانے میں آسانی رہے۔ ندیم نے کتنی بار کوشش کی مگر اِنجن گھرر گھرر کرتے اور پھر بند ہو جاتے۔

ندیم نے اِشارے سے بلال اور ضرار کو جہاز کی دُم چھوڑ کر پیچھے ہٹ جانے کے لیے کہا۔ پھر اُس نے ایک بار اور کوشش کی اور شاہین سٹارٹ ہو گیا۔ پہلے وُہ اُسے دُور تک دوڑاتا ہُوا لے گیا اور پھر وُہ زمین سے اُونچا ہَوا میں اُٹھ گیا۔ ندیم نے وادی کے گرد تین چار چکرّ لگائے اور اس کے بعد کافی دُور نکل گیا۔

"میرے خیال میں وُہ نیلی روشنی والے کوہِ نُور کو دیکھنے گیا ہے۔" ضرار نے بلال سے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" بلال نے کہا۔

ندیم نے چند چکرّوں کے بعد جہاز واپس اُسی جگہ پر اُتارا جہاں سے اُڑایا تھا۔ جب وُہ جہاز سے باہر نکلا تو بلال نے سوال کیا کہ کیا جہاز کے اِنجن دُرست ہیں؟

"ہاں، بالکُل دُرست ہیں۔" ندیم بولا۔ "جب میں اس نیلے پہاڑ کے آس پاس کی پہاڑیوں تک پہنچتا تھا تو اِنجن گھرر گھرر کرنے لگتے تھے اور جب اِن سے دُور ہٹتا تھا۔ تو گڑگڑاہٹ ختم ہو جاتی تھی۔ اب اِس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ کوہِ نُور میں ریڈیم کی موجُودگی ہے۔ اِسی ریڈیم کی شعاعوں کی وجہ سے اِنجن رُکنے لگتا ہے۔ جب میں کوہِ نُور کے بُہت اُوپر جہاز لے گیا تو میرے قُطب نما کی سُوئی بھی کام نہیں کرتی تھی۔ اب ہمیں کوہِ نُور تک پیدل ہی چلنا ہو گا۔"

"کوہِ نُور کیسا معلُوم ہوتا تھا؟" چاچی نے پُوچھا۔

"بالکُل عام پہاڑوں جیسا۔" ندیم نے جواب دیا۔

"کیا تُم نے وہاں کوئی اور چیز دیکھی؟" چاچی نے پُوچھا۔

"ہاں" ندیم بولا۔ "کوہِ نُور کے قریب ہی گندمی رنگ

کی زمین کا ایک ٹکڑا تھا۔ معلوم نہیں کیا چیز ہے۔ میرا خیال ہے عمارتیں ہوں گی۔"

"خیر، ہمیں اب اور دیر نہیں کرنی چاہیے۔" چاچی نے کہا۔

"ٹھیک ہے" ندیم نے کہا "آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔"

انھوں نے جلدی جلدی تیاری کی۔ ندیم کے ہاتھ میں رائفل تھی اور ضرار نے بندوق اُٹھا رکھی تھی۔ آصف اور چاچی خالی ہاتھ تھے۔ انھوں نے کوہِ نور کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں کئی چھوٹے چھوٹے راستے نظر آئے۔ پندرہ منٹ تک ایک سیدھے راستے پر چلنے کے بعد وہ ایک طرف مُڑ گئے۔

سب خاموشی سے چل رہے تھے۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قدم اُٹھاتے ہوئے زور لگانا پڑتا ہے۔ کیپٹن ندیم جو سب سے آگے تھا ایک دم رُک گیا اور بولا:

"یُوں لگتا ہے جیسے ہم سے پہلے بھی کوئی شخص یہاں سے گزرا ہے۔"

"اُف" ضرار کے مُنہ سے نکلا۔

"کیا بات ہے؟" ندیم نے پُوچھا۔

ضرار نے اِشارہ کیا۔ چند گز کے فاصلے پر کسی اِنسان کا ڈھانچا پڑا ہُوا تھا۔ پاس ہی پھٹے ہُوئے کپڑوں کے ٹکڑے بکھرے ہُوئے تھے جن پر مٹی کی تہیں جم چکی تھیں اِس کے قریب ہی چند اور ڈھانچے بھی تھے۔

سب حیرت سے اُنھیں دیکھ رہے تھے۔ اچانک ندیم کی نظر ایک چمکیلی چیز پر پڑی۔ وُہ آگے بڑھا اور مٹی ہٹا کر اس چیز کو زمین میں سے نکال لیا۔ رُومال سے مٹی صاف کرنے پر معلُوم ہُوا کہ یہ چاندی کا بنا ہُوا سگریٹ کیس ہے۔ اُسے دیکھنے کے لیے سب ندیم کے قریب آ گئے۔ ندیم نے بٹن دبا کر اُسے کھولا تو اُس کے اندر یہ الفاظ لکھے ہُوئے تھے:

شیخ جمیل احمد کی نذر
بیگم شیخ جمیل احمد کی جانب سے
عیدُالفِطر 1938ء

"میرے خیال میں" ندیم بولا "یہ ہندُوستان کا کوئی شخص تھا۔ اُسے یہ سگریٹ کیس عید کے موقع پر اُس کی بیوی نے دیا ہوگا۔"

"شیخ جمیل احمد؟" چاچی نے مُنہ میں بُڑبُڑا کر کہا اور پھر زور سے بولے۔ "ارے، یہ تو وہی شخص ہے، جو

۱۹۴۰ء میں پانچ ساتھیوں کے ساتھ چھین گیا تھا مگر بعد
میں اِن لوگوں کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ افسوس
اِن بے چاروں کو موت نے کہاں آن گھیرا۔ دکھاؤ سگریٹ
کیس۔"

ندیم نے سگریٹ کیس چاچی کو دیتے ہوئے کہا "چلیے
جائیے ورنہ وقت ضائع ہو گا۔"

وہ تھوڑی دُور ہی گئے ہوں گے کہ چاچی نے کہا۔
"ذرا ایک منٹ ٹھہرو۔ میری سانس پھُول گئی ہے۔ سمجھ
میں نہیں آتا کہ میں اتنی جلد تھک کیوں گیا ہُوں۔"

تھکنے کی شکایت سب کو تھی۔ ندیم نے کہا "مجھے
معلُوم ہوتا ہے جیسے میرے پاؤں من من بھر کے ہو
گئے ہیں۔"

صرف ایک ضرار ایسا تھا جو اُسی طرح پھرتی سے چل
رہا تھا۔ ندیم نے ایک لمحے کے لیے پیچھے مُڑ کر دیکھا
اور حیران ہو کر کہنے لگا "یہ دیکھو جس جس جگہ پر ہمارے
قدم پڑتے ہیں وہاں نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے ذرّے
بکھرتے جاتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے اپنے کندھے سے رائفل اُتاری ا
زمین پر پڑے ہوئے ایک دانے کو چھُوا۔ "ذرّہ" ز

سے دھماکا ہُوا اور گولی خُود بخُود چل گئی۔ ندیم کو ایسا جھٹکا
لگا کہ سر کے بل زمین پہ گر پڑا۔ اس کے چہرے کی رنگت
پیلی پڑ گئی۔

"چوٹ تو نہیں آئی۔" چاچی نے پُوچھا۔

"نہیں۔ خُدا کا شکر ہے" ندیم نے جواب دیا۔ پھر اُس
نے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مگر ایسا معلُوم ہُوا جیسے
اُس کے پاؤں زمین نے جکڑ لیے ہیں۔

"کیپٹن" آصف چیخ کر بولا "میرے پاؤں زمین نے
پکڑ لیے ہیں۔ اُف!"

چاچی بھی گھبرا کر بولے "زمین نے میرے قدموں کو
بھی جکڑ لیا ہے" بلال کا بھی یہی حال تھا۔

صرف ضرار ایسا تھا جو اس مُصیبت سے آزاد تھا اُس
نے ندیم کو سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو ندیم
بولا "مجھے مت چھُونا۔ کسی کو بھی نہ چھُونا" ضرار کی
اُنگلیوں کے سِروں سے نیلی نیلی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔
جنھیں ندیم نے دیکھ لیا تھا۔

"اپنی جگہ سے کوئی نہ ہلے" ندیم چلّا کر بولا۔ "زمین
میں بجلی دوڑ رہی ہے۔ جہاں کھڑے ہو وہیں جمے رہو۔"
سب کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے۔ آصف نے

سخت تکلیف کے ساتھ کہا - "بلال، مجھے اپنا ہاتھ دینا - میرا جسم اکڑا جا رہا ہے ۔" بلال نے ہاتھ بڑھانا چاہا تو وہ بھی چیخ اٹھا: "اُف، میری ٹانگیں - سخت درد ہو رہا ہے -"

"شور مت مچاؤ" ندیم نے غصّے سے کہا - "ہم مشکل میں پھنس چکے ہیں - اِس سے چھٹکارا پانے کی ترکیب سوچو۔"

"ضرّار بالکل ٹھیک ٹھاک ہے - پتا نہیں کیا وجہ ہے" چاچی بولے -

ضرّار نے آگے بڑھ کر ندیم کی رائفل اُٹھائی اور ایک طرف رُخ کر کے چند فائر کر دیے -

"وہ مارا" ضرّار خوشی سے چلّایا -

"کیا؟ ــــ کیسے مارا؟" ندیم نے حیران ہو کر پوچھا -

"میں نے بھی گرتے دیکھا ہے" بلال نے کہا -

"کِسے دیکھا ہے؟" ندیم نے پوچھا -

"کوئی سایہ ہماری طرف بڑھ رہا تھا - میں نے اُس پر فائر کیے - میں نے اُسے زمین پر گرتے دیکھا ہے - وہ - وہ دیکھیے - وہ اب اِنسانی شکل میں آ رہا ہے -" ضرّار نے اُنگلی کے اِشارے سے بتایا - سب اُدھر دیکھنے لگے - اُن سے کچھ فاصلے پر کسی شخص کی لاش پڑی ہوئی

تھی جو شکل سے تبتی معلوم ہوتا تھا - اُس کا جسم ننگا اور رنگت پیلی تھی -

تھوڑی دیر بعد چاچی نے کہا - "گولی مارو اِس آدمی کو اور اپنی جان کی سلامتی مانگو - میری ٹانگیں یُوں اکڑتی جا رہی ہیں - جیسے کسی نے اُن پر پلستر کر دیا ہے -"

"چاچی" ندیم نے کہا: "اِس آدمی نے ہم سب کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی مگر اللہ نے ہمیں بچا لیا -" پھر وُہ ضرّار کی طرف مُنہ کر کے بولا - "اِدھر آنا - میرے قریب -"

ضرّار قریب آیا تو ندیم اُسے غور سے دیکھنے لگا -

"میں بھی کہوں" ندیم نے کہا - "ضرّار اپنی آزادی سے کیسے گھوم پھر رہا ہے - اس نے تو پاؤں میں ربڑ کے چپل پہن رکھے ہیں اور ربڑ پر بجلی اثر نہیں کرتی - آپ میں سے کسی کے پاس ربڑ کی کوئی چیز ہے؟" سب نے انکار میں سر ہلا دیا -

"کیپٹن" آصف کچھ یاد کرتے ہوئے بولا - "ہمارے پاس ایسے واٹر پروف کاغذ ہیں جن پر بجلی کا اثر نہیں ہوتا -"

"لیکن وُہ تو جہاز میں ہیں" چاچی نے کہا -

"اب کیا کیا جا سکتا ہے؟" بلال نے آہستہ سے کہا۔

"میرے خیال میں" ندیم نے کہا۔ "بچ نکلنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ قرار، تم تیزی سے جاؤ اور کاغذوں کا بنڈل اُٹھا لاؤ۔ جلدی کرو ورنہ ہم سب تھوڑی ہی دیر میں جل کر کوئلہ ہو جائیں گے۔"

"بہت اچھا کیپٹن" یہ کہہ کر قرار جہاز کی طرف بھاگا۔ اور چند ہی لمحوں میں نظروں سے غائب ہو گیا۔

تھوڑی دیر تک سب خاموش رہے۔ پھر ندیم نے قدم اُٹھایا اور بندوق کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن دو قدم اُٹھانے کے بعد ہی وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ پھر بھی اُس نے بندوق کا دستہ کسی نہ کسی طرح پکڑ ہی لیا۔

"بلال، چند کارتوس پھینکو" ندیم نے کہا۔

بلال نے کارتوس پھینکے۔ ندیم نے ہوا میں سے اُنھیں دبوچ لیا اور پھر بندوق میں بھرنے لگا۔

"اگر ہم کوشش کریں" آصف نے کہا۔ "تو ایک ایک قدم اُٹھاتے ہوئے کافی پیچھے جا سکتے ہیں۔"

سب نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر پاؤں زمین سے اُٹھتے ہی نہ تھے۔

کچھ دیر بعد چاچی نے پوچھا۔ "قرار کتنی دیر میں آ

جائے گا؟"

"میرے خیال میں اُسے بیس پچیس منٹ لگیں گے۔" ندیم نے کہا۔

"کتنی دیر ہو گئی ہے اُسے؟" چاچی نے پھر پوچھا۔

"تقریباً بیس منٹ" ندیم نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر گھڑی بند ہو گئی تھی۔ چاچی بہت کمزور دکھائی دے رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں اور وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے تھے۔ اچانک انھوں نے بائیں طرف دیکھا۔ اُس طرف ایک غار تھا۔

"ندیم! اُدھر دیکھو" چاچی نے کہا۔

سب اُسی طرف دیکھنے لگے۔ اس غار میں سے سفید دودھیا رنگ کی کوئی بہت بڑی چیز اُن کی طرف رینگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اُس کے جسم کے اِرد گرد ہلکے نیلے رنگ کی دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ پہلے تو سب اُسے حیران ہو کر دیکھتے رہے پھر بلال نے پوچھا۔ "کیپٹن، یہ کیا چیز ہے۔"

خوف کے مارے کوئی بھی نہ بول سکا۔

"اُف میرے اللہ" چاچی بولے "یہ تو بہت بڑے بڑے کن کھجورے ہیں۔ سب کے منہ کھلے ہوئے ہیں۔"

کُن کھجورے آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ چاچی، بلال، آصف اور ندیم نے بھاگنے کی کوشش کی مگر دو قدم اُٹھا سکنے کے بعد تیسرا قدم کوئی نہ اُٹھا سکا۔ اب اُن کو موت سامنے نظر آ رہی تھی۔

"اگر ضرار دو تین منٹ تک نہ آیا تو یہ ہم سب کو چٹ کر جائیں گے۔" ندیم نے کہا۔

ندیم کا خیال غلط نکلا۔ کن کھجورے اِن کے بجائے اُس چینی کی طرف جا رہے تھے جسے ضرار نے گولی مار کر ہلاک کیا تھا۔ ایک منٹ کے اندر اندر کن کھجوروں نے لاش کا سارا گوشت کھا لیا اور اب وہاں ہڈیوں کا ایک ڈھانچا پڑا ہوا تھا۔ پھر کن کھجورے آہستہ آہستہ اُن کی جانب بڑھنے لگے۔ ضرار کا کچھ پتا نہ تھا۔ ندیم نے بندوق اُٹھائی اور ڈز ڈز دو فائر کر دیے۔ گولیاں کن کھجوروں کے لگیں مگر اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب وہ قریب آ چکے تھے۔ موت سامنے تھی اور سب آسمان کی جانب مُنہ کیے دِل ہی دِل میں دُعائیں مانگ رہے تھے۔

اب کن کھجورے اِن سے صرف بیس 20 گز کے فاصلے پر تھے۔ بلال کی آنکھیں بند تھیں۔ چاچی یوں لگتے تھے جیسے ابھی گر جائیں گے۔ بھاگنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔ ندیم

مرنے کے لیے تیار تھا۔ مگر اُس نے جی میں ٹھان لی تھی کہ ان میں سے دو چار کو مار کر مروں گا۔ اچانک چند قدم کے فاصلے سے ضرار کی آواز آئی:

"میں — آ — گیا — ہوں۔" وہ پسینے پسینے ہو رہا تھا اور اُس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کاغذوں کا بنڈل تھا۔

سب نے مُڑ کر دیکھا اور اُن کے مُردہ جسموں میں جیسے جان سی پڑ گئی۔

"اللہ تیرا شکر ہے" ندیم نے کہا اور پھر ضرار سے بولا "جلدی کرو۔ زمین پہ کاغذ بچھا دو۔"

ضرار نے حیرت انگیز پھرتی سے بنڈل میں سے کاغذ نکالے اور زمین پر ایک چٹائی سی بنا دی۔ کن کھجورے صرف دس گز کے فاصلے پر تھے۔ ضرار کاغذوں کو علٰحدہ علٰحدہ ہر شخص کے پاؤں کے قریب رکھنے لگا۔ کن کھجورے اب پانچ گز کے فاصلے پر تھے۔ بلال اور آصف نے زور لگا کر پاؤں زمین سے اُٹھائے اور چٹائی پر آ گئے۔

"انھیں پاؤں کے اُوپر تک لپیٹو اور رومال باندھ لو۔" ندیم نے بلال اور آصف سے کہا۔

ندیم اپنے پاؤں کے گرد کاغذ لپیٹ چکا تھا اور اب

آسانی سے زمین پر چل سکتا تھا۔

"اِدھر آؤ ضرّار، چاچی کو سنبھالو" ندیم نے کہا اور دونوں چاچی کو بازوؤں سے پکڑ کر کاغذ کی چٹائی پر لے گئے۔ چاچی جیسے گہری نیند سے جاگے اور ایک دم آنکھیں کھول کر کچھ بولے مگر کسی نے کچھ نہ سُنا۔ ضرّار اور ندیم اُن کے پاؤں کے گرد کاغذ لپیٹ رہے تھے۔

کُن کھجورے اِن سے اب صرف دو گز کے فاصلے پر تھے۔

"بھاگو" ندیم نے چاچی کو بازو کا سہارا دیتے ہوئے چلّا کر کہا اور سب تیزی سے بھاگ اُٹھے۔

ایک اجنبی

وُہ بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ تقریبًا ایک سو گز کے فاصلے پر جا کر ندیم نے گردن گھما کر دیکھا اور پھر ٹھہر گیا۔

"اب ہم خطرے سے باہر ہیں۔" اُس کی آواز سُن کر سب ٹھہر گئے۔

"اب آپ اِن کاغذوں کو کھول کر اِس ڈوری سے اچھی طرح باندھ لیں" ضرّار نے اپنی جیب سے ڈوری نکال کر ندیم کو دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے اُس وقت گھبراہٹ میں خیال ہی نہ رہا"

سب لوگ کاغذوں کو گھٹنوں تک لپیٹ کر اُسے ڈوری سے باندھنے لگے۔ اب وُہ آسانی سے چل پھر سکتے تھے۔

"نہ جانے اُن کُن کھجوروں کا کیا بنا؟" چاچی نے کہا۔

ندیم بولا "ٹھہریے میں دیکھ کر ابھی آتا ہوں"

"اپنے آپ کو مصیبت میں مت ڈالو" چاچی نے

ناراض ہوتے ہُوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں اگر وُہ .... ارے! وُہ اُس چٹان پر کوئی آدمی دِکھائی دیتا ہے۔ وُہ دیکھو" ندیم اُنگلی سے اشارہ کرتے ہُوئے بولا۔

اچانک سامنے سے ایک آواز آئی۔ اِس آواز کو سُن کر یُوں معلُوم ہوتا تھا جیسے کوئی شخص مُصیبت میں گرفتار ہے۔ چند لمحے بعد پھر آواز آئی۔ "مدد — مدد — بچاؤ"

سب اُس طرف دیکھنے لگے۔ آخر ندیم نے کچُھ سوچتے ہُوئے کہا: "چاچی، یہ شخص ضرور کسی مُشکل میں پھنسا ہُوا ہے۔ ہمیں اِس کی مدد کرنا چاہیے"

وُہ شخص چٹان پر اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا تھا جسے وُہ ہَوا میں گھما رہا تھا۔

ندیم نے کہا: "ضرّار، تُم میرے ساتھ آؤ۔ بندُوق تُم لے لو اور یہ رائفل مجھے پکڑا دو۔ چاچی، آپ اور آصف خیمے میں چلے جائیں۔ بلال تُم بھی اُن کے ساتھ جاؤ — شاہین کا خیال رکھنا۔"

ندیم اور ضرّار چٹان کی طرف چل پڑے۔ جب وُہ کَن کھجُوروں کے قریب سے گُزرے تو ندیم نے پاؤں سے ایک کَن کھجُورے کو ٹھوکر ماری۔ وُہ مُردوں کی طرح لُڑھک گیا۔

"میرے خیال میں یہ مر چُکے ہیں" ضرّار نے کہا۔

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ جلدی چلو۔" ندیم نے کہا۔

جب چٹان پر کھڑے آدمی نے اُنھیں اپنی طرف آتے دیکھا تو ہاتھ ہِلا ہِلا کر چیخا: "جلدی — جلدی کرو۔"

اُن کے سامنے ایک سُرنگ تھی۔ دونوں سُرنگ میں داخل ہو گئے اور اِس میں سے ہوتے ہُوئے دُوسری طرف جا نکلے۔ وہاں ایک گلی سی تھی اور سُرنگ کے مُنہ سے ذرا ہٹ کر سامنے ایک دروازہ تھا اِس دروازے میں سیڑھیاں تھیں جو سیدھی اُوپر چٹان کو جاتی تھیں۔ دونوں سیڑھیاں چڑھنے لگے اور پھر چٹان کی چھت پر جا پہنچے۔

"نیلی روشنی" ضرّار نے بائیں طرف اشارہ کیا اور پھر ایک دم فائر کر دیا۔ نیلی روشنی غائب ہو گئی — دائیں طرف وہی شخص ہَوا میں ڈنڈا چلا رہا تھا۔ وُہ بُوڑھا تھا۔ اور اُس کی ڈاڑھی بڑھی ہُوئی تھی۔ معلُوم ہوتا تھا۔ اُس نے کئی دِنوں سے حجامت نہیں کی ہے۔ ضرّار اور ندیم اُس کے پاس گئے اور اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

اچانک اُنھیں سیڑھیوں میں سے چند نیلی شعاعیں نظر آئیں۔ ندیم بھاگ کر سیڑھی کے پاس گیا اور اُس نے رائفل

سے فائرنگ شروع کر دی ۔ سیڑھی میں سے چیخوں کی آوازیں آئیں اور پھر کوئی شخص تیزی سے بھاگ اُٹھا ۔

"چلیے ۔" ندیم نے بابا سے کہا ۔

"نہیں ۔ ہم ابھی جا نہیں سکتے " بابا بولا ۔

"کیوں ؟" ندیم نے پُوچھا ۔

" اُدھر دیکھیے ۔ کَن کھجوروں کی طرف ۔" بابا نے کہا ۔ اور ایک بٹن دبا دیا وُہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کَن کھجورے پھر ہلنے جُلنے لگے ہیں اور اب واپس اُسی غار کی طرف آرہے ہیں ۔ جس میں سے نکلے تھے ۔ اِسی غار میں سے ہو کر ندیم اور ضرار ابھی چٹان پر آئے تھے ۔

" یہ کیسے زندہ ہو گئے ؟" ندیم نے پُوچھا ۔

" اِن کا کرنٹ میں نے بند کر دیا تھا ۔ اب پھر کرنٹ جاری کر دیا تو پھر زندہ ہو گئے ۔ یہ بدبختی میرے پیچھے بھاگے تھے تاکہ مجھے کرنٹ بند نہ کرنے دیں ۔ مگر میں اپنی جان پر کھیل گیا اور آپ بچ گئے ۔"

"آپ کون ہیں بابا ؟" ندیم نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا ۔

" میں پٹھان ہُوں اور پشاور میں پیدا ہُوا تھا ۔" بابا نے کہا ۔

"لیکن آپ کی اُردو تو بہت صاف ہے ۔" ندیم نے کہا ۔۔۔

"میں نے بی ۔ اے علی گڑھ میں کیا تھا ۔ پھر انگلینڈ سے انجینئرنگ کی ڈگری لی ۔" بابا بولا ۔

"آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں ۔"

"میرا نام عبدُالغنی ہے ۔"

" میں ندیم احمد ہُوں اور یہ میرا دوست ضرار ہے ۔" ندیم نے اپنا اور ضرار کا تعارُف کراتے ہُوئے کہا ۔

" ہم ان سیڑھیوں سے اُتر کر واپس کیوں نہیں جا سکتے ؟" ضرار نے پُوچھا ۔

" باہر جانے کا راستہ یہ سیڑھیاں ہی ہیں ۔ مگر اِس غار میں کَن کھجورے آ گئے ہیں ۔"

"آپ ان کا بٹن دبا کر اُنھیں بے بس کیوں نہیں کر دیتے ؟" ضرار بولا ۔

"ایسا کر تو دُوں اور تمھارے ساتھ بھی چل پڑوں ۔" عبدُالغنی نے کہا ۔" لیکن میں ذرا بھی بٹن کے پاس سے ہٹا تو ڈر ہے کہ وُہ لوگ یہاں آ کر پھر بٹن کو اُونچا کر دیں گے ۔ اس طرح یہ کَن کھجورے پھر غار میں واپس آ کر ہمیں نگل لیں گے ۔ پہلی دفعہ انھوں نے ہی بٹن دبایا تھا ۔

"اب کیا کیا جائے ؟" ندیم نے پوچھا ۔

"اِدھر میرے ساتھ آؤ" عبدُالغنی نے ندیم سے کہا ۔

چٹان کی چھت پر ایک کمرہ تھا ۔ عبدُالغنی نے دیوار میں لگی ہوئی ایک ٹیوب میں لوہے کا ایک ڈنڈا داخل کر دیا ۔ گڑگڑاہٹ ہوئی اور چند لمحوں میں اُن کے سامنے ایک خوب صورت سا کمرہ تھا ۔

ندیم اور ضرار عبدُالغنی کے ساتھ اندر چلے گئے ۔۔۔ سامنے کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی ۔ تینوں کھڑکی کے پاس آئے ۔ وہاں سے اُنھیں ساری وادی نظر آ رہی تھی ۔ دُور ، فاصلے پر اُن کا جہاز کھڑا تھا اور پاس ہی خیمے کے باہر چاچی ، آصف اور بلال بیٹھے ہوئے تھے ۔

"ہم باہر جا سکتے ہیں ۔ بشرطیکہ تمھارے ساتھی جہاز لے کر آ جائیں" انجینئر عبدُالغنی نے کہا ۔

ندیم نے کہا " لیکن اُن تک ہماری آواز کیسے پہنچے گی ؟ دُوسرے یہ کہ جہاز کے انجن بھی ٹھیک کام کریں"۔

عبدُالغنی نے کہا " انجن تو ٹھیک ہیں "

"آپ کو کیسے پتا چلا ؟" ضرار نے پوچھا ۔

"میں نے اُس شُعاع کو بند کر دیا ہے جو انجن میں خرابی پیدا کرتی ہے " عبدُالغنی انجینئر بولا ۔

"اب پتا چلا کہ انجن کی خرابی کی وجہ کوئی خاص شُعاع ہے ۔" ندیم نے کہا ۔ " نہ معلوم ابھی اور کیا کچھ ہونے والا ہے ۔۔۔"

"میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گا ۔ ابھی میں بارہ گھنٹے اور زندہ رہوں گا ۔ ہائے پشاور ۔ قصّہ خوانی بازار" انجینئر عبدُالغنی نے اُداس ہو کر کہا ۔

"کیا کہا آپ نے ؟ آپ بارہ گھنٹے اور زندہ رہیں گے ؟" ندیم نے پوچھا ۔

"بارہ سے بھی کم " عبدُالغنی نے جواب دیا ۔

"یہ آپ کیسے کہتے ہیں ؟" ندیم نے سوال کیا ۔

"یہ پھر بتاؤں گا " عبدُالغنی نے کہا ۔ " پہلے اپنے ساتھیوں کو یہاں بُلانے کا انتظام کرو "

"کیسے ؟" ندیم نے کہا ۔ " نہ تو وہ ہمیں دیکھ رہے ہیں اور نہ ہماری آواز وہاں تک جا سکتی ہے "

انجینئر عبدُالغنی نے اُنھیں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور گھاس اکٹھی کرنے کے لیے کہا ۔ پھر اُنھوں نے آگ جلائی اور انتظار کرنے لگے ۔ ندیم نے بندوق سے ایک کے بعد ایک تین فائر کیے ۔ تین گولیاں ایک جیسے وقفوں پر چلانے کا مطلب ہے کہ کوئی شخص مدد مانگ رہا ہے ۔

چاچی، بلال اور آصف نے گولیوں کی آواز سُن لی۔ چاچی
خیمے میں گئے اور اپنا کوٹ لا کر ہَوا میں لہرانے لگے۔ اس
کا مطلب تھا کہ وُہ آ رہے ہیں۔

پھر وُہ تینوں جہاز میں بیٹھے اور بلال نے جہاز سٹارٹ
کیا۔ جہاز ہَوا میں بُلند ہو گیا اور تھوڑی ہی دیر میں چٹان
پر اُتر آیا۔ عبدُالغنی انجینئر، ضرار اور ندیم بھی اُوپر آ گئے
تھے۔ پہلے جہاز میں سے چاچی اُترے پھر آصف اور آخر
میں بلال۔

"کیا بات ہے؟" چاچی نے پُوچھا۔ "یہ کون صاحب ہیں؟"

"اِن کا نام عبدُالغنی ہے۔ یہ انجینئر ہیں۔ اُنھوں نے ہی
ہماری جان بچائی ہے۔" ندیم بولا۔

"آپ یہاں کیسے آئے؟" چاچی نے حیرت سے کہا۔

"میں آیا نہیں، لایا گیا ہُوں۔" عبدُالغنی نے کہا۔

"کب؟" چاچی نے پُوچھا۔

"اچھی طرح یاد نہیں۔ شاید پچاس سال ہُوئے۔"

"یہ سُن کر سب حیران ہو گئے۔ چاچی نے کہا کہ آپ
کی تو عُمر ہی ابھی پچاس سال ہو گی۔"

عبدُالغنی انجینئر نے کہا۔ "اُنھوں نے ۱۹۱۵ء میں مجھے
گرفتار کیا تھا۔ اُس وقت میری عُمر چالیس برس کی تھی۔"

"اُنھوں نے آپ کو کہاں سے گرفتار کیا تھا؟" آصف
نے کہا۔

"میں ایک بحری جہاز میں چین جا رہا تھا کہ سمندری
لُٹیروں نے حملہ کر دیا۔ باقی لوگوں کو تو اُنھوں نے مار ڈالا۔
مجھے پکڑ لیا۔ میری موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔ آہ
پشاور۔ قِصّہ خوانی بازار۔"

ندیم نے چاچی کو حیران ہوتے دیکھا تو اُنھیں بتایا کہ
عبدُالغنی صاحب کو پشاور سے بے حد محبّت ہے۔ پھر اُس
نے عبدُالغنی سے کہا۔

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کو اپنی موت
کا وقت کیسے معلوم ہو گیا؟"

"سب کُچھ بتا دُوں گا۔" عبدُالغنی نے کہا۔

"جاؤ بلال شاہین میں سے قالین لے آؤ۔"

بلال نے جہاز سے قالین نکالا اور سب لوگ اُس پر
بیٹھ گئے۔ انجینئر عبدُالغنی نے کچھ دیر دم لے کر اپنی کہانی
شروع کی۔

عبدالغنی کون تھا

انجینئر عبدالغنی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "جب سورج ڈوبے گا تو میں مر جاؤں گا۔ یہ میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ آنے والے وقت کے لیے پہلے سے تیار رہیں۔ ان لوگوں نے مجھے ایک بوٹی کا رس پلا پلا کر اس کا عادی بنا دیا ہے۔ یہ رس میں پچھلے پچاس برس سے پی رہا ہوں۔ اگر یہ رس مجھے بارہ گھنٹے تک نہ ملے تو میرا جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔"

"کیا نام ہے اس بوٹی کا؟"

"مجھے اس کا نام معلوم نہیں مگر اس کی رنگت سرخ ہے اس بوٹی کا عادی بنا کر انھوں نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا ہے۔ چوں کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اس لیے انھوں نے مجھ پر کسی آدمی کو نگرانی کے لیے مقرر نہیں کیا۔ جب مجھے پتا چلا کہ آپ لوگ یہاں آئے ہوئے

ہیں تو میں آپ کی جان بچانے کے لیے باہر نکل آیا۔ آپ سے پہلے بھی اس جگہ کئی لوگ آئے تھے مگر وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

"جب ان لوگوں کو میرے باہر نکل آنے کا پتا چلا تو وہ مجھے جان سے مارنے کے لیے میرے پیچھے لگ گئے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اب آپ کو اس بوٹی کا رس نہیں دیں گے۔" بلال نے پوچھا۔

"ہاں" عبدالغنی نے کہا۔

"اور رس کے بغیر آپ زندہ نہیں رہ سکتے۔" بلال بولا۔

"ہاں۔ مجھے آٹھ گھنٹے سے بوٹی نہیں ملی۔ میں بس چار گھنٹے کا مہمان ہوں۔"

سب لوگ عبدالغنی کی حالت پہ افسوس کر رہے تھے۔ صرف آصف خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ جب عبدالغنی خاموش ہوا تو وہ بولا۔

"اس بوٹی کے بارے میں آپ کو جو کچھ معلوم ہو بتائیے"

"مجھے اور کچھ معلوم نہیں۔" عبدالغنی نے جواب دیا۔

آصف نے کہا "دنیا میں کوئی نشہ ایسا نہیں جس کا توڑ موجود نہ ہو۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے جہاز کے اندر چلا گیا اور وہاں سے دوائیوں کا بکس اٹھا لایا۔ پھر اس نے

ٹیکا لگانے والی پچکاری نکالی اور عبدُالغنی سے کہا۔ "بازو پھیلائیے۔ میں آپ کے خُون کا اِمتحان کرنا چاہتا ہُوں۔"

عبدُالغنی نے اپنا بازُو پھیلایا اور آصف نے چند قطرے خُون لے کر بکس اُٹھایا اور جہاز کے اندر جاتے ہُوئے بولا۔ "آپ اپنی کہانی جاری رکھیے۔ میں بعد میں اپنے ساتھیوں سے سُن لُوں گا۔"

"جیسا کہ میں نے ابھی بتایا ہے۔" عبدُالغنی نے کہا۔ "ہمارا بحری جہاز جب چین کے قریب سے گزرا تو سمندری ڈاکوؤں نے اِس پر حملہ کر دیا۔ اُنھوں نے سارا سامان لُوٹ لیا اور میرے سوا سب آدمیوں کو قتل کر دیا۔ بعد میں مُجھے پتا چلا کہ اِن ڈاکوؤں نے صِرف مُجھے گرفتار کرنے کے لیے جہاز پر حملہ کیا تھا۔"

"یہ لوگ آپ کو کیوں پکڑنا چاہتے تھے؟" بلال نے پُوچھا۔

"اِس لیے کہ۔" عبدُالغنی نے کہا۔ "میں ایک انجینئر تھا اور اِن تبّتیوں کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی، جو اِن کی مشینوں کو کھول سکتا اور پھر جوڑ سکتا۔ میرے خیال میں آپ نے کوہِ نُور پہاڑ کا نام سُنا ہو گا۔"

"ہاں اِس کے مُتعلّق ہم تھوڑا بہت جانتے ہیں۔"

ندیم نے کہا۔ "لیکن جو کچھ اس پہاڑی کے بارے میں کہا جاتا ہے کیا وُہ سچ ہے؟"

"بالکُل سچ ہے۔ میں نے یہاں کبھی کسی آدمی کو بیمار ہوتے نہیں دیکھا۔" عبدُالغنی بولا۔

"تو پھر یہاں لوگ مرتے کس طرح ہیں؟" ندیم نے پُوچھا۔

"یہاں کے لوگ بہت لمبی عُمر پاتے ہیں۔" عبدُالغنی نے کہا۔ "بعض لوگ دو دو تین تین سو سال تک زندہ رہتے ہیں۔ جب یہ لوگ بہت بوڑھے ہو جاتے ہیں تو مرتے ہیں۔"

"یہ لوگ کھاتے کیا ہیں؟" چاچی نے پُوچھا۔

"ہر قِسم کا اناج اور سبزیاں۔ صِرف گوشت نہیں کھاتے۔"

ندیم نے بات بدلتے ہُوئے کہا۔ "غنی لالہ، اِس پہاڑ میں سُنا ہے ریڈیم موجُود ہے؟"

"اِس پہاڑ میں ریڈیم کے خزانے ہیں۔ اِتنی مقدار میں ریڈیم دُنیا کی کسی جگہ پر موجُود نہیں۔ اگر انجینئروں کو پتا چل جائے کہ یہاں اِتنی ریڈیم ہے تو وُہ اِس سے دُنیا کی کایا پلٹ دیں۔ اِس سے روشنی، حرارت اور طاقت سب کچھ حاصل کی جا سکتی ہے۔"

"بعض پڑھے لکھے اور عقل مند تبتیوں نے، جنھوں نے باہر کے ملکوں میں تعلیم پائی تھی، یہاں اِتنی ریڈیم دیکھی تو اُنھوں نے تجربے شروع کر دیے۔ وُہ چاہتے تھے کہ ساری دُنیا کو فتح کر لیں۔ وہ سالہا سال تک محنت کرتے رہے اُنھیں کام یابی ہونے ہی والی تھی کہ اُن کی تجربہ گاہوں میں دھماکا ہُوا اور سب سائنس دان ہلاک ہو گئے۔ صِرف چند آدمی بچ سکے۔

"جو لوگ بچ گئے تھے اُنھوں نے پھر سے تجربے کرنے شروع کر دیے۔ کئی سال تک وُہ تجربے کرتے رہے ــــ کام یابی قریب تھی کہ ایک دفعہ پھر زور دار دھماکا ہُوا اور سب کچھ تباہ ہو گیا لیکن چند لوگ پھر بھی بچ گئے۔ اُنھوں نے بھی تجربے جاری رکھے اور اب وُہ کام یاب ہونے والے ہیں۔ اُن کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ یورپ سے بہت سی مشینیں لے آئے ہیں۔ لیکن اِن کو شروع میں یہ معلوم نہ تھا کہ اِن مشینوں سے کام کیسے لیا جاتا ہے اِس کے لیے اُنھیں ایک اِنجینئر کی ضرورت تھی۔ اِن کو پتا چلا کہ ایک اِنجینئر جہاز میں سفر کر رہا ہے تو اُنھوں نے مجھے گرفتار کرنے کے لیے جہاز پر حملہ کر دیا اور مجھے پکڑ کر یہاں لے آئے۔

"جب مجھے یہاں کام کرتے ہُوئے بیس برس گزر گئے۔ تو اِن لوگوں نے ایک اور انجینئر کو گرفتار کر لیا۔ جب اُسے اِن لوگوں کا مقصد معلوم ہُوا کہ یہ لوگ دُنیا کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں تو اُس نے کام کرنے سے اِنکار کر دیا۔ اُنھوں نے اُسے ایک کُنوئیں میں پھینک دیا جہاں اُسے کَن کھجوروں نے ہلاک کر دیا۔ آہ، میں نے اِتنا بہادر اِنسان کبھی نہیں دیکھا۔"

"غنی لالہ" ندیم نے کہا۔ "آپ بتا رہے تھے۔ کہ کچھ چیزوں کو یہ لوگ بجلی کے ذریعے قابو میں رکھتے ہیں۔"

"ہاں" غنی بولا: "یہ بڑے عجیب لوگ ہیں۔ یہ ہماری طرح نہیں سوچتے۔ یہ چاہتے تھے کہ روشن پہاڑ سے اجنبی لوگوں کو پرے رکھا جائے۔ اِس مقصد کے لیے اُنھوں نے سانپوں اور بچھوؤں کی نسل سے ایک نئی قسم کے کَن کھجورے پیدا کیے۔ یہ بے حد خطرناک اور زہریلے تھے۔ اِن کی وجہ سے کوئی بھی شخص اس پہاڑ کے قریب آنے کی جُرأت نہ کرتا تھا۔ لیکن ایک دِن غلطی سے سب کَن کھجورے بھاگ نکلے اور اُنھوں نے یہاں کے بہت سے لوگوں کو کھا لیا۔ پھر اِن لوگوں نے ایک اور قسم کے کَن کھجورے پیدا کیے۔ یہ زہریلے تو نہیں تھے۔ مگر اِنسان کا گوشت کھاتے تھے۔ وُہ

تجربے کرتے رہے اور آخر میں اُنھوں نے کَن کھجوروں کی
ایسی نسل تیار کی جن کے پاؤں کے تلووں میں چھوٹی چھوٹی
گدّیاں تھیں۔ یہ کَن کھجورے صِرف اُس وقت چل سکتے
ہیں۔ جب اُن کے تلووں کے نیچے بجلی کا کرنٹ ہو۔ آپ
پر جن کَن کھجوروں نے حملہ کیا تھا وُہ اُسی نسل سے ہیں۔

"پھر اِن لوگوں نے ایک قسم کا پانی تیار کیا ہے۔ جس کا
نام دافِعِ برق ہے۔ اِس پانی کا ایک ایک ڈبّا ہر گھر میں
رکھا ہُوا ہے۔ یہ لوگ صُبح سویرے اپنے ہاتھ اور پاؤں اس
پانی میں بھگو لیتے ہیں تو سارا دِن بجلی کا اُن پر اثر نہیں
ہوتا —

"اِن لوگوں نے ایک نئی قسم کی شعاع بھی دریافت کی
ہے۔ اِس کی رنگت نیلی ہے۔ جب یہ نیلی شُعاع کسی شخص
کے جسم پر پڑتی ہے تو پہلے اُسے سُن کر دیتی ہے۔ پھر وُہ
آدمی اندھا ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد پاگل ہو کر مر
جاتا ہے۔

"یہ لوگ ہر وقت تجربے کرتے رہتے ہیں اور اِنھوں نے
حیرت انگیز چیزیں ایجاد کر لی ہیں لیکن سب سے حیرت انگیز
ایک ایسی دَوا ہے جس کو پی کر آدمی نظروں سے غائب ہو
جاتا ہے۔ وُہ تو سب کو دیکھ سکتا ہے لیکن اُسے کوئی نہیں

دیکھ سکتا۔ ہاں البتّہ اُس کے اِرد گِرد ایک نیلے رنگ کی
دُھند سی چھا جاتی ہے۔ یہ دوا اُنھوں نے ایک خاص قسم کے
پودے سے تیار کی ہے اور اس کا پتا صِرف اُنھی کو معلوم
ہے —

"یہ لوگ بے حد خطرناک ہیں اور سالہا سال کی محنت کے
بعد اب یہ لوگ کام یاب ہونے ہی والے ہیں اور چند دِنوں
کے بعد یہ ساری دُنیا کو اپنا غُلام بنانے یا تباہ کر دینے کے
لیے نکل کھڑے ہوں گے۔"

"دُنیا کو یہ لوگ کیسے تباہ کر سکتے ہیں؟" چاچی نے
پُوچھا —

"سب سے پہلے یہ لوگ اِس پہاڑ پر سے نیلی شُعاعیں
ہر طرف ڈالیں گے جو ایک ایک سو میل کے اندر ہر
جان دار کو ہلاک کر کے رکھ دیں گی۔ پھر ایک سو میل کے
فاصلے پر یہ لوگ نئے اڈّے قائم کریں گے اور وہاں سے
موت کی یہ شُعاعیں ہر طرف ڈالیں گے۔ اور ایک ایک سو
میل کے اندر کی ہر چیز کو فنا کر دیں گے۔ اِس طرح یہ
چند ہی روز میں ساری دُنیا کو ختم کر دیں گے۔ بڑی سے
بڑی بری اور بحری فوج اِن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ہاں یہ
لوگ ہوائی جہازوں سے کافی پریشان ہیں۔ لیکن اِس کا بھی

اُنھوں نے ایک توڑ کر رکھا ہے ۔ اِس پہاڑ کی شعاعوں سے ہَوائی جہازوں کے انجن بند ہو جاتے ہیں ۔ لیکن اگر ہَوائی جہاز کے انجن پر "دافعِ برق" پانی مَل دیا جائے تو پھر یہ شعاعیں اِس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں ۔"

"کیا آپ کے پاس یہ پانی ہے ؟" ندیم نے جلدی سے سوال کیا ۔

"ہاں ہے" غنی بولا ۔ "میرے پاس ایک بوتل رکھی ہے اور وُہ میں آپ کو ضرور دُوں گا ۔ اِس کا اثر اِنجن پر کئی دِن تک رہے گا ۔

"اِس پہاڑ سے ایک ہزار فُٹ نیچے ان لوگوں کا اڈّا ہے جس کی چھت پر اُنھوں نے ایک مصنوعی جھیل بنا رکھی ہے یہ لوگ اپنے اڈّے سے ہی ہر چیز کو قابُو میں رکھتے ہیں ۔ میرے خیال میں اِس جیسا خطرناک اڈّا ساری دُنیا میں اور کہیں نہیں ۔ اِن لوگوں کا سردار اِس اڈّے کا نگران ہے ۔ اور سب کام اُسی کے حُکم سے ہوتے ہیں ۔ اِس کا نام چنگ فرنگ ہے ۔ اڈّے پر ہر وقت زبردست پہرا لگا رہتا ہے خُود مجھے بھی اس میں داخل ہونے کی بُہت کم اِجازت ہے جب کبھی میں وہاں جاتا ہُوں تو میرے اِرد گرد پہرے دار ہوتے ہیں ۔"

"آج جب آپ لوگ یہاں آئے تو میں اُن کے اڈّے میں تھا ۔ اُنھوں نے آپ کو ہلاک کرنے کے لیے زمین پر بجلی چھوڑ دی ۔ میں نے نظر بچا کر دافعِ برق پانی کا ایک ڈرم مشین پر اُنڈیل دیا ۔ جس سے زمین میں بُہت کم بجلی رہ گئی ۔ پھر اُنھوں نے ایک مشین کا بٹن دبا کر کَن کھجُوروں کو کھول دیا تاکہ وُہ آپ کو کھا جائیں ۔ میں پریشان ہو گیا میں نے لوہے کے ایک ڈنڈے سے اُس بٹن کو توڑ دیا ۔ بجلی بند ہو گئی اور کَن کھجُورے بے جان ہو گئے ۔ وُہ لوگ میرے پیچھے بھاگے تو میں بچتا بچاتا یہاں بھاگ آیا ۔ تاکہ آپ کو خطرے کی اِطّلاع دے سکوں ۔ یہاں وُہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ۔"

"میرے اللہ" چاچی کے مُنہ سے نکلا ۔ "ہمیں چاہیے کہ ہم ساری دُنیا کے لوگوں کو اِن کے اڈّے اور کوہِ نُور کے بارے میں بتا دیں ۔ ورنہ یہ وحشی تو دُنیا کو تباہ کر دیں گے ۔"

غنی نے کہا ۔ "آپ کا جانا بے کار ہے ۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دُنیا آپ کی باتوں کو سچ نہیں سمجھے گی ۔ اگر سچ سمجھ بھی لیا اور کچھ لوگ آپ کے ساتھ یہاں آئے تو یہ لوگ زمین میں بجلی چھوڑ دیں گے اور آپ سب جل کر کوئلہ ہو جائیں گے ۔ پھر ان کے پاس کَن کھجُورے ہیں جو

آدمیوں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی مُلک کی ہوائی فوج بھی منگا لیں تو وُہ بھی بے کار ثابت ہوگی۔ کیوں کہ کوہِ نُور کے ریڈیم کی شعاعوں سے ان جہازوں کے اِنجن بے کار ہو جائیں گے۔ اِس کے عِلاوہ یہ لوگ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ایسی صُورت میں یہ جس کو چاہیں ہلاک کر دیں گے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ تقریباً ایک دو ہفتوں میں یہ لوگ دُنیا پر حملہ کرنے والے ہیں۔"

سب خوف زدہ ہو کر عبدُالغنی کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر ندیم نے کہا: "غنی لالہ، آپ ہی بتائیے ہم دُنیا کو اِس مُصیبت سے کیسے بچا سکتے ہیں؟"

"میرے خیال میں اگر آپ اِن کا اڈّا تباہ کر دیں تو پھر یہ لوگ بے بس ہو جائیں گے۔ یہی ایک طریقہ ہے دُنیا کو بچانے کا۔ اب مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اتنے میں آصف اپنے بائیں ہاتھ میں خُون کا نمونہ اور دائیں ہاتھ میں پچکاری پکڑے "بچ گئے ۔۔ بچ گئے" چلّاتا ہُوا آیا۔

"کون بچ گئے؟ بات کیا ہے؟" چاچی نے پُوچھا۔

آصف خُوشی سے ناچتے ہُوئے بولا: "غنی لالہ کو جو نشہ دیا جاتا رہا ہے۔ اس میں سُرخ رنگ کی افیون اور کوئی

اور میٹھی چیز مِلی ہُوئی ہے۔ میں نے ایک دَوا کا ٹیکا تیار کیا ہے جس سے غنی صاحب کے خُون میں موجود ساری افیُون باہر نِکل جائے گی۔ شروع میں اِن کو تکلیف تو ہو گی مگر اسے برداشت کرنا پڑے گا۔ لائیے غنی صاحب، بایاں بازُو نکالیے میں آپ کو ٹیکا لگا دُوں۔ اِنشاءَاللہ آپ صحت یاب ہو جائیں گے۔"

یہ کہہ کر آصف نے ٹیکے کے ذریعے ساری دوا غنی کے جسم میں داخل کر دی۔

غنی کے چہرے پر ایک اُداس مُسکراہٹ پھیل گئی۔ وُہ کہنے لگا: "ممکن ہے میری قسمت میں پشاور دیکھنا ہو۔"

"یقیناً۔ آپ زندہ رہیں گے۔ میں نے نشے والی جڑی بُوٹیوں پر بہت تجربے کیے ہیں اور میں اُن کا ماہر ہو گیا ہُوں۔" آصف نے مُسکرا کر چاچی اور دُوسروں کی طرف دیکھا

"مجھے چکر آ رہے ہیں ۔۔۔" غنی اِتنا کہہ کر بے ہوش ہو گیا۔ ندیم نے آگے بڑھ کر اُسے تھاما۔ آصف نے بتایا کہ اِن کا بے ہوش ہو جانا بہتر ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ میری دَوا کام یاب رہی ہے۔

ندیم بولا: "میرے خیال میں سب کو بھوک لگ رہی ہے پہلے عبدُالغنی صاحب کو جہاز میں لٹاتے ہیں پھر کھانا کھائیں گے۔"

خوف ناک رات

جب وُہ کھانا کھا کر فارغ ہُوئے تو سُورج غرُوب ہو چُکا تھا۔ آصف نے جا کر اپنے مریض کی نبض ٹٹولی۔ وُہ بالکُل ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی۔

"دیکھو، کوہِ نُور سے پھر روشنی نکلنا شرُوع ہو گئی ہے۔ اب تو ہمیں لیمپ جلانے کی بھی ضرُورت نہیں۔" بلال نے کہا۔ "وُہ کوہِ نُور کی چوٹی نظر آ رہی ہے۔"

"یہ روشنی ہے تو بُہت خُوب صُورت مگر بُہت خطرناک بھی ہے۔" ندیم بولا۔ "اگر ہمارے پاس راکٹ ہوتے تو میں اِس اڈّے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔"

یہ سُن کر ضرار خُوشی سے اُچھل پڑا اور کہنے لگا۔ "کیوں نہ پاکستان سے جا کر چند بم لے آئیں؟"

بلال نے پُوچھا۔ "بم انار کلی بازار میں بِکتے ہیں یا کوئی سبزی فروش اپنی ریڑھی پر لاد کر "بم لے لو بم" کی آوازیں لگاتا پھرتا ہے؟"

"میری مُراد ہے، فوج سے لے لیں" ضرار نے جھینپ کر کہا۔

"فوج ہمیں راکٹ دے دے گی؟" بلال نے ہنس کر کہا —

"ہم اُن کو یقین دِلائیں گے کہ ہم اِن راکٹوں کو نیک مقصد کے لیے اِستعمال کرنا چاہتے ہیں۔" ضرار نے کہا۔

"تُمھارا اِعتبار کرتا کون ہے؟" بلال نے کہا۔

ضرار کُچھ کہنے لگا تھا کہ چاچی نے غُصّے سے دونوں کی طرف دیکھا اور وُہ خاموش ہو گئے۔

"میرے خیال میں سب سے پہلے تو ہمیں جہاز کے اِنجنوں کے بارے میں کُچھ کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ پھر شُعاعیں ڈالنا شرُوع کر دیں جِس سے اِنجن خراب ہو جائیں۔" ندیم بولا۔

بلال نے کہا۔ "لالہ غنی نے کہا تھا کہ دافِع برق پانی مَل دینے سے اِنجن پر اِن شُعاعوں کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔"

"یہ تو دُرست ہے" ندیم بولا۔ "لیکن اگر پانی نے کام نہ کیا تو کیا ہو گا؟"

"جب تک کوئی دُوسرا اِنتظام نہیں ہو جاتا ہمیں چاہیے

کہ اِسی پانی کو اِنجنوں پر ملیں۔ یہاں روشنی کافی ہے۔ اِس لِیے ہم یہ کام آسانی سے کر لیں گے۔" بلال نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ چلو یہی سہی۔" ندیم نے کہا۔ "آؤ جہاز کے اِنجنوں پر پانی ملیں۔"

اُنھوں نے غنی کی دی ہُوئی بوتل سے پانی نِکال نِکال کر اِنجن کے تمام پُرزوں پر ملنا شرُوع کر دِیا۔ چُوں کہ ان کے پاس برش نہیں تھے اور وُہ ہاتھوں سے پانی مل رہے تھے اِس لِیے اُن کو بڑی محنت کرنا پڑی۔ کہیں آدھی رات کے قریب وُہ اِس کام سے فارغ ہُوئے۔ اچانک آصف نے اِعلان کِیا کہ لالہ غنی ہوش میں آ گئے ہیں اور اب اُن کے بچ جانے کی اُمّید سو فی صد ہے۔ سب نے آصف کو مُبارک باد کہا۔

بلال نے ہاتھوں کو سونگھتے ہُوئے کہا۔ "اِس پانی کو ملنے کے بعد ہاتھوں سے عجیب طرح کی بو آ رہی ہے۔ آئیے کیپٹن، ہاتھ دھو لیں۔"

"کیوں؟ دھوئیں کیوں؟ رہنے دو یُونہی۔ تُم نے سُنا نہیں تھا لالہ غنی سے کہ اس کو ہاتھوں پر مل لینے سے بجلی کا جھٹکا نہیں لگتا۔" ندیم بولا۔

وُہ اُٹھ کر غنی کے پاس گئے۔ جو جہاز کے اندر لیٹا

ہُوا تھا۔ اُس کا مُنہ دُوسری طرف تھا۔ آہٹ سُن کر اُس نے مُنہ اِس طرف کر لیا اور آنکھیں کھول کر کہنے لگا۔ — "کیا میں ابھی تک زندہ ہُوں؟"

"تو پھر یہ کون بول رہا ہے؟" ندیم نے مُسکرا کر کہا۔ "آصف کی دَوا سے آپ ایک دفعہ پھر سے جوان ہو جائیں گے۔"

"آہ! پشاور۔ قِصّہ خوانی بازار۔" عبدُالغنی نے اُداس ہو کر کہا۔

"خُوچے فکر مات کرو غنی لالہ، اَم آپ لوگ کو قِصّہ خوانی بازار ضرُور لے جائے گا۔ اب اَم لوگ کو آپ ہنس کر دِکھائے گا۔" ندیم نے پٹھانوں کی طرح اُردُو بولتے ہُوئے کہا۔ اور غنی سمیت سب ہنس پڑے۔

غنی اُٹھ کر بیٹھ گیا اور ندیم سے کہنے لگا۔ "اب آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟"

"سچ پُوچھیے تو ہمیں کچھ پتا نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ آپ ہوش میں آ جائیں تو کل صُبح کو آپ کو ساتھ لے کر ہوائی جہاز پر اِس سارے علاقے کا چکّر لگاؤں۔ اور ایک دفعہ یہاں کی بہت سی جگہیں دیکھ لُوں۔ اگر اُنھوں نے حملہ کِیا تو میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ جہاز پر سے

بڑے بڑے پتھر ان پر برساؤں گا ۔ پھر جو ہوگا سو دیکھا
جائے گا ۔"

" بالکل بالکل " غنی مسکرا کر بولا ۔" جو لوگ چاہتے ہیں
کہ اِن پر پتھر نہ برسیں اُن کو شیشے کے گھروں میں نہیں
رہنا چاہیے ۔"

" شیشے کے گھر ؟ کیا مطلب ؟" ندیم نے پوچھا ۔

" میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ ان لوگوں کے گھر شیشے
کے بنے ہوئے ہیں ۔" غنی نے کہا ۔

" شیشے کے گھر کیوں ؟" ندیم نے پوچھا ۔

" اِس لیے " غنی نے کہا ۔" کہ شیشے میں سے بجلی کا کرنٹ
نہیں گزر سکتا ۔ یہ لوگ شیشے کو پگھلا کر اِس میں دافع برق
پانی ملا دیتے ہیں جس سے شیشے کا رنگ پیلا ہو جاتا ہے ۔
ایک فایدہ تو یہ ہوتا ہے کہ اِن کو بجلی کا ڈر نہیں رہتا ،
اور دوسرے یہ کہ رات کے وقت کوہِ نور کی روشنی اِن
کے گھروں میں داخل نہیں ہو سکتی ۔ اگر یہ لوگ ایسا نہ
کریں تو تھوڑے ہی عرصے میں کوہِ نور کی روشنی سے اندھے
ہو جائیں ۔ اگرچہ شیشہ فولاد کی طرح سخت ہوتا ہے لیکن
جب ٹوٹتا ہے تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے ۔"

" لیکن آپ یہ بتائیں کہ اِن پر حملہ کیسے کیا جائے ؟ کیا

رائفل ٹھیک رہے گی ؟" ندیم نے پوچھا ۔

" رائفل سے تو آپ اِن کے چند ایک ہی مکان توڑ
سکیں گے ۔ اڈا تو پھر بھی قائم رہے گا ۔" غنی نے جواب
دیا ۔۔

" آپ ٹھیک کہتے ہیں ۔ ہمارے پاس اِتنا اسلحہ نہیں ہے
کہ سب کو ختم کر سکیں ۔" ندیم بولا ۔" میرے خیال میں تو ہوائی
جہاز میں بڑے بڑے پتھر بھر کر اِن پر برسائے جائیں ۔ کیسا
رہے گا ؟"

" بلندی سے پتھر برسا کر آپ اِن کو کافی نقصان پہنچا
سکتے ہیں ۔ لیکن شاید آپ نے بتایا تھا کہ آپ کے پاس فقط
اِتنا پٹرول ہے جس سے آپ واپس گھر جا سکیں ۔ ایسی صورت
میں تو آپ کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی ۔ پھر ایک
اور بات بھی ہے کہ جہاز سے آپ اُن کے مکان تو توڑ سکیں
گے ، اڈے کو تباہ نہیں کر سکیں گے ۔"

ندیم سوچ میں پڑ گیا پھر اُس نے کہا ۔" اچھا لالہ اِس
سکیم کے بارے میں اب کل صبح ہی کچھ سوچیں گے ۔"

فرار باہر چٹان کی چھت پر تھا ۔ اچانک وہ بھاگتا ہوا
آیا اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی ۔ ندیم نے پوچھا ۔" کیا
بات ہے ؟ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو ؟"

"کیپٹن، یہ نبتی ہمیں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔" ضرار نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں ابھی ابھی اِس چٹان کی سیڑھیوں سے ہو کر آیا ہوں۔ وُہ اس چٹان میں برمے سے چھید کر کے اچانک چھت پر آجانا چاہتے ہیں۔"

ندیم نے غنی سے کہا "کیا اِن لوگوں کے پاس برمے بھی ہیں ؟"

"اِن کے پاس ایسے برمے ہیں۔" غنی نے کہا "جن کی نوک پر ریڈیم لگی ہوئی ہے۔ ریڈیم کی وجہ سے یہ برمے پتّھر میں سے بھی اِس طرح گُزر جاتے ہیں جس طرح چاقو مکھّن کی ٹکیا میں سے گُزر جاتا ہے۔ خُوش قِسمتی کی بات یہ ہے کہ اِن لوگوں کے پاس بندُوق، رائفل یا مشین گن وغیرہ نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں ہمیں صِرف باتیں ہی نہیں کرنی چاہئیں کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلانے چاہئیں۔ ورنہ وُہ سُرنگ لگا کر یہاں پہنچ گئے تو ہم مُشکل میں پھنس جائیں گے" ندیم نے کہا۔ "غنی لالہ، آپ یہیں آرام فرمائیں۔ ہم ابھی واپس آتے ہیں۔ آصف آپ کے پاس رہے گا۔"

یہ کہہ کر ندیم، ضرار، چاچی اور بلال نے رائفل، بندُوق اور ریوالور اُٹھائے اور جہاز سے نکل کر چٹان کی سیڑھیاں

اُترنے لگے۔ شور کی آواز چٹان سے کوئی سو گز کے فاصلے سے آرہی تھی۔ نیچے آ کر سب اُسی طرف چل پڑے۔ چٹان کے نیچے ایک گلی بنی ہُوئی تھی۔ وُہ گلی میں سو قدم کے قریب گئے ہوں گے کہ انھیں ایک جگہ سے گھرر گھرر کی آواز آئی مگر کوئی شخص نظر نہ آیا۔

"یہ آواز کس طرف سے آرہی ہے ؟" ندیم نے آہستہ سے کہا۔

"سامنے سے" ضرار نے کہا "میرے خیال میں یہاں کوئی غار ہے۔ وُہ غار کے اندر ہی اندر سے ہم تک پہنچنا چاہتے ہیں۔"

سب غار کی دِیوار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اچانک دِیوار میں سے مٹّی نکل نکل کر باہر گرنا شروع ہو گئی۔ ندیم نے ہاتھ کے اِشارے سے سب کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہاں ایک چھید دِکھائی دینے لگا ندیم آگے بڑھا اور اس نے اپنی رائفل کا مُنہ چھید میں رکھ کر غار کے اندر گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ غار میں سے چند چیخوں کی آوازیں آئیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"آپ ذرا فاصلے پر کھڑے ہو جائیں" ندیم نے کہا۔

"ہر طرف خیال رکھیں۔ کچھ پتا نہیں کس وقت اور کس طرف سے کوئی کھوڑے یا نیلی شعاعیں ہم پر حملہ کر دیں۔"

بیس منٹ تک سب خاموش کھڑے رہے۔ لیکن کچھ نہ ہُوا۔ آخر ندیم بولا "میں اِن چھوٹی چھوٹی جھڑپوں سے تنگ آ گیا ہُوں۔ میں پاکستانی ہُوں اور پاکستانی چوروں کی طرح چھپ کر لڑنے کے بجائے کھلے میدان میں للکار کر لڑنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہم میں سے ایک شخص یہاں ٹھہرے اور اگر کوئی ایسی ویسی بات دیکھے تو ہمیں خبر کر دے۔ ہم اُوپر لالہ غنی کے پاس جاتے ہیں۔"

فرّار وہاں ٹھہر گیا اور باقی لوگ سیڑھیاں چڑھتے ہُوئے چٹان کی چھت پر آ گئے۔ ابھی وُہ اُوپر آئے ہی تھے کہ سیڑھیوں میں سے فرّار کی آواز آئی۔ "کیپٹن، اِس چھید میں سے کسی شخص کی آواز آ رہی ہے۔ معلُوم ہوتا ہے وُہ ہم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

"غنی لالہ" ندیم نے کہا "آپ اِن لوگوں کی بولی سمجھتے ہیں۔ کیا آپ ہمارے ساتھ نیچے تک چلیں گے؟"

"کیوں نہیں" غنی نے کہا اور اُٹھ کر چھید کے پاس آ گیا۔ ندیم نے آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چھید کے مُنہ میں رائفل کی نالی پھنسا دی۔

اچانک غار میں سے کسی کے بولنے کی آواز آئی اور غنی اُس سے باتیں کرنے لگا۔ دونوں طرف سے چُوں چُوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد غنی نے ندیم کی طرف مُنہ کر کے کہا۔ "وُہ کہہ رہے ہیں کہ اگر آپ لوگ آج صُبح سے پہلے پہلے یہاں سے چلے جائیں اور پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہ کریں تو یہ آپ کو اور نُقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

"یہ ہمیں اور نُقصان نہیں پہنچائیں گے؟" ندیم نے غنی سے کہا "اِن سے کہیے کہ ابھی تک تُم نے ہمیں کوئی نُقصان نہیں پہنچایا۔"

غنی نے وہی بات اُن تک پہنچا دی۔ ایک منٹ باتیں کرنے کے بعد غنی نے ندیم سے کہا "وُہ کہتے ہیں آپ اِن کے سردار چنگ فرنگ سے بات کرنا پسند کریں گے؟"

"کہاں؟" ندیم نے پُوچھا۔

"اُن کے محل میں" غنی نے کہا۔

"نہیں۔ اُن سے کہو اگر وُہ مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے تو یہیں اِسی غار کے اندر آ کر اِس چھید میں سے بات کر لے۔ میں اپنے آپ کو گُن کھوڑوں کی خُوراک نہیں بنانا چاہتا۔"

غنی نے اُن سے باتیں کرنے کے بعد ندیم سے کہا "وُہ کہتے ہیں اگر تُم لوگ واپس نہ گئے تو وُہ تُم پر نیلی شعاعوں

سے حملہ کر دیں گے۔"

ندیم نے کہا۔" اُن سے کہہ دیجیے کہ جو کچھ تُم کرنا چاہتے ہو کر دیکھو۔ اِس سے پہلے کہ تُم ہم پر حملہ کرو۔ ہم تُمھارے شیشے کے گھروں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں گے۔"

غنی نے ان سے بات کی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ بتّی واپس چلے گئے تھے۔

"اُنھوں نے اور کیا کہا تھا؟" ندیم نے پُوچھا۔

"کچھ نہیں۔" غنی نے کہا۔" وُہ حیران تھے کہ میں ابھی تک زندہ کیسے ہوں۔ ان کے حساب سے مجھے اب تک مر جانا چاہیے تھا۔ جاتی دفعہ وُہ کہہ گئے ہیں کہ وہ ہمیں تڑپا تڑپا کر ماریں گے۔"

"میں اب سمجھا۔ یہ ہمیں زندہ پکڑنے کے لِیے آئے تھے۔ تاکہ ہمیں عذاب دے دے کر ماریں۔ چلیے چلیں۔" ندیم نے کہا اور وُہ گلی میں سے ہوتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھنے لگے اور پھر چٹان کی چھت پر آ گئے ـــــ ندیم غور سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تھوڑی دُور کے فاصلے پر اُنھیں ایک چوٹی نظر آئی۔

"غنی لالہ، یہ چوٹی ہماری چٹان کی چھت سے بُلند ہے نا؟" ندیم نے سوال کیا۔

"ہاں" غنی نے کہا۔

ابھی وُہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اسی چوٹی سے ایک نیلی شُعاع اندھیرے کو چیرتی ہُوئی آئی اور شاہین پر پڑی ندیم نے "لیٹ جاؤ" کہا اور سب زمین پر لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ایک شُعاع اور آئی اور وُہ پھر زمین پر لیٹ گئے۔ شُعاع جہاز سے ٹکرا کر واپس چلی گئی۔" غنی لالہ" ندیم نے کہا۔" اگر یہ نیلی شُعاعیں جہاز سے ٹکراتی رہیں تو اِس پر کیا اثر ہو گا؟"

"اگر ایک گھنٹے تک لگاتار یہ شُعاعیں کسی دھات پر پڑتی رہیں تو اُس کو سُرمہ بنا دیتی ہیں اور دھات اِس طرح کی ہو جاتی ہے جیسے بسکٹ ہو۔"

ندیم نے خوف زدہ نظروں سے غنی کو دیکھا اور کہا۔" غنی لالہ، ہمارا جہاز تو سارے کا سارا دھات کا بنا ہُوا ہے۔"

"تب تو یہ بات بُہت بُری بات ہُوئی۔" غنی نے کہا۔

" ندیم نے نیلی شُعاعوں والی چوٹی کی طرف اِشارہ کر کے کہا۔" وہاں سے نیلی شُعاعیں نکلتی ہیں۔ چاچی مُجھے کارتوس اور بندُوق دیجیے۔"

"تُم کرنا کیا چاہتے ہو؟" چاچی نے بندُوق پکڑاتے ہُوئے پُوچھا ـــ

"اِس چوٹی پر فائر کروں گا جہاں سے یہ نیلی شُعاع آتی ہے۔" ندیم نے جواب دیا۔

"لیکن جو آدمی پھینک رہے ہیں" غنی نے کہا۔ "وُہ تو چُھپے ہُوئے ہوں گے۔ اُنھیں تُمھاری گولی نہیں لگ سکتی۔"

"اگر میں اُس آدمی کو ہلاک نہ کر سکا جو یہ شُعاعیں ڈال رہا ہے تو کم از کم شُعاعیں پیدا کرنے والی ٹارچ کو تو توڑ دُوں گا۔" ندیم نے کہا۔

اور یہ کہہ کر اُس نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ روشنی ایک دم غائب ہو گئی۔

"وُہ مارا" ندیم نے خُوشی سے چِلّاتے ہُوئے کہا۔

"کیا ٹارچ ٹُوٹ گئی؟" چاچی نے پُوچھا۔

"ٹُوٹی نہیں۔ لیکن بُجھی ضرور ہے۔" ندیم بولا۔

"توڑ دو تب مزہ ہے۔" چاچی نے کہا۔

"میرے خیال میں چوٹی میرے اندازے سے زیادہ دُور ہے۔" ندیم نے کہا۔ "اچھا میں پھر کوشش کرتا ہُوں۔"

ابھی وُہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ نیلی روشنی پھر نظر آنے لگی۔ ندیم نے بار بار فائرنگ کی مگر روشنی تھوڑی دیر کے لیے بُجھتی اور پھر جل اُٹھتی۔ آخر ندیم بولا۔ روشنی یہاں سے بہت دُور ہے۔ میں یُونہی کارتوس ضائع کرتا رہا۔

کیوں نہ یہ جگہ چھوڑ کر اُسی جگہ چلے جائیں۔ جہاں ہم نے پہلے خیمہ لگایا تھا؟"

"آپ کا خیال ہے کہ وہاں ہم اِس روشنی سے بچ جائیں گے؟ وُہ کُھلی جگہ ہے وہاں روشنی اور آسانی سے آ سکتی ہے" غنی نے کہا۔

"محفُوظ جگہ تو پھر ایک ہی ہے یعنی اُوپر ہَوا میں اُڑ جائیں۔"

ندیم نے کہا۔ "لیکن میں پٹرول کو اِن بے کار قسم کی چیزوں میں ضائع نہیں کر سکتا۔"

ندیم نے ایک بار پھر ٹارچ پر گولیاں چلائیں۔ مگر وُہ اِتنی دُور تھی کہ گولی وہاں تک پہنچ ہی نہ سکی۔ اچانک ایک تیز شُعاع آئی اور سب جلدی سے زمین پر لیٹ گئے۔

"غنی لالہ۔ اِن کے پاس نیلی شُعاعیں پھینکنے والی کتنی ٹارچیں ہیں؟" ندیم نے پُوچھا۔

"سینکڑوں" غنی نے کہا۔ "کچھ تو جیبی ہیں اور ایک بہت بڑی ٹارچ ہے جو وُہ سامنے کی چوٹی پر لگی ہُوئی ہے لیکن اِس کے اِستعمال کا موقع کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ کیوں کہ عام طور پر اس جگہ پر لوگ نہیں آتے۔ یہ بے حد خطرناک ہے۔"

"اگر وہ چوٹی والی ٹارچ تباہ ہو جائے تو پھر کئی دنوں تک ہم اِن شعلوں سے چھٹکارا پا لیں گے۔" چاچی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"اِس چوٹی کا راستہ ہے کس طرف؟" ندیم نے پوچھا۔

اچانک چوٹی سے ایک شعاع پھر نکل کر آئی، اور شاہین پر پڑی۔ سب لیٹ گئے تھے۔ غنی نے ندیم کو چوٹی کا راستہ بتاتے ہوئے کہا۔ "اِس چھت کے اسی طرف جس طرف یہ کوہِ نور ہے، ایک راستہ بنا ہوا ہے یہ راستہ بل کھاتا ہوا بہت دور ایک شہر کی طرف جا نکلتا ہے۔ بہرحال آپ کو یہاں سے تقریباً آدھے میل کے فاصلے پر دائیں ہاتھ چوٹی پر جانے والی سیڑھیاں نظر آئیں گی۔ مجھے یہی ایک راستہ معلوم ہے۔"

"کیا اس چوٹی کے پرے کوئی ایسی جگہ ہے جہاں شعاعیں نہ پہنچتی ہوں اور وہاں ہم جہاز بھی آسانی سے اُتار سکیں۔" ندیم نے پوچھا۔

"ہاں" غنی نے کہا۔ "اِس چوٹی کی دُوسری جانب ایک بڑا سا میدان ہے جہاں ہم جہاز کھڑا کر سکتے ہیں۔ کاش ہم وہاں پہنچ سکیں۔"

اِتنے میں پھر ایک شعاع آئی۔ سب لیٹے ہُوئے تھے۔

جہاز کو جب شعاع چھوتی تو ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوتی۔

"اگر شعاعیں یُوں ہی آتی اور جہاز سے ٹکراتی رہیں تو جہاز تباہ ہو جائے گا۔" ندیم نے کہا۔ "ہمیں سب سے پہلے اس چوٹی کی ٹارچ بُجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

ندیم تیزی سے سوچنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُسے ایک ترکیب سُوجھ گئی تھی۔ شعاعیں بار بار آ کر جہاز سے ٹکرا رہی تھیں۔ اُس نے ضرار سے کہا۔ "ذرا مجھے وہ ریشمی رسّی جہاز سے لا دو جو ہم پہاڑیوں پر اُترنے چڑھنے کے لیے لائے ہیں۔ تین سو گز لمبی رسّی ہے۔ میرے خیال میں یہ چٹان مشکل سے دو سو گز اُونچی ہو گی اور بلال تم اِن سب کو جہاز میں بٹھا کر اُس جگہ پہنچو۔ جہاں ہم نے آ کر خیمہ گاڑا تھا۔ وہاں روشنی نہیں پہنچ سکتی۔ اگر وہاں بھی پہنچ جائے تو جہاز کو اُٹھا کر کہیں اور جگہ لے جاؤ۔ بس صُبح تک اِس روشنی سے بچو۔ صُبح مجھے اور ضرار کو اِس چوٹی کی دُوسری جانب والے کھُلے میدان میں ملو۔ ہم دونوں اِس چوٹی والی ٹارچ کو بُجھانے جا رہے ہیں۔"

ضرار دوڑ کر ریشمی رسی لے آیا۔ ندیم نے رائفل اور ضرار نے بندوق میں گولیاں بھریں۔ رسّی چٹان سے نیچے لٹکا دی گئی۔ سب نے مل کر مضبوطی سے اُسے پکڑ لیا۔

"بلال" ندیم نے کہا "لالہ غنی، چاچا اور آصف کو خُدا کے بعد تمہارے سپرد کر رہا ہُوں۔ خُوب ہوشیار رہنا۔ بس چند گھنٹے کی تکلیف ہے۔ پھر انشاء اللہ نیلی روشنی ہمارا کچُھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"

"فکر نہ کریں کیپٹن" بلال نے کہا۔

"خُدا حافِظ" ندیم نے کہا اور رسّی پکڑ کر بجلی کی سی تیزی سے چٹان سے نیچے اُتر گیا۔ اِس کے بعد ضرّار بھی نیچے آ گیا۔

خطرناک سفر

ندیم اور ضرّار چٹان سے نیچے اُتر آئے تھے۔ چھت پر رسّی واپس کھینچ لی گئی تھی۔ جُونہی اُنھوں نے زمین پر قدم رکھا اُن کے پاؤں زمین میں دھنسنے لگے۔

"میرے اللہ" ضرّار نے آہستہ سے ندیم سے کہا۔ "کیپٹن ہمارے قدموں تلے تو دَلدَل ہے۔"

"نہیں۔ میرے خیال میں یہ دَلدَل نہیں" ندیم نے کہا "کبھی پہاڑوں پر بھی دَلدَل ہُوا کرتی ہے؟ اگر دَلدَل ہوتی تو یہاں درخت کیسے اُگ سکتے تھے۔"

ضرّار خاموش رہا۔ دونوں کے پاؤں زمین میں دھنس گئے تھے۔ ندیم نے زور لگا کر ایک پاؤں اُٹھانے کی کوشش کی تو دُوسرا پاؤں آدھی پنڈلی تک زمین میں دھنس گیا۔ ضرّار کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ دَلدَل ہے۔ اُس نے کہیں پڑھا یا سُنا تھا کہ دَلدَل میں پھنسنے کی صُورت میں

زور نہیں لگانا چاہیے بلکہ چت لیٹ جانا چاہیے۔ وُہ چت لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ندیم گھٹنوں سے ذرا نیچے تک زمین میں دھنس چکا تھا۔ موت سامنے نظر آ رہی تھی۔

تین چار منٹ تک وُہ دلدل سے نکلنے کے لیے کوشش کرتے رہے۔ اِن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جائے۔ اچانک ضرار کو ایک خیال آیا اور اُس نے اپنی بندوق سے ہوا میں تین فائر کیے۔ خوش قسمتی سے چھت پر ابھی تک جہاز کھڑا تھا۔ فوراً ہی بلال نے اُوپر سے جھانک کر کہا "کیا ہے؟"

"دلدل! دلدل" ضرار نے آواز دی۔

اسی لمحے نیلی شعاع پھر سے چٹان کی چھت پر پڑی اور بلال فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بلال چھت پر سے چلّایا "کیا ہے؟"

"دلدل دلدل۔ رسّی پھینکو" ندیم نے جواب دیا۔

بلال نے یہ بات دُوسروں کو بتائی تو وُہ حیران سے رہ گئے۔ اچانک لالہ غنی بولا "اوہ میرے اللہ! اس چٹان کے نیچے تو واقعی ایک کنویں کے گھیر کے برابر دلدلی جگہ ہے۔ جب ان بستیوں میں سے کوئی کسی کو قتل کرتا ہے

تو وُہ اُسے سزا کے طور پر اِس چٹان سے گرا کر دلدل میں پھینک دیتے ہیں۔ اُف، جلدی رسّی پھینکو ورنہ وُہ دھنس جائیں گے۔"

بلال نے رسّی لٹکا کر آواز دی "یہ ساری جگہ دلدل نہیں ہے۔ رسّی پکڑ کر صرف چند فٹ اُوپر آنا ہم رسّی کو دُوسری طرف کر دیں گے۔ وہاں اُتر جانا۔"

سب نے زور لگا کر پہلے ندیم کو دلدل سے نکالا۔ کیوں کہ وُہ گھٹنوں دلدل میں دھنس چکا تھا۔ اُسے زمین سے پانچ چھ فُٹ اُونچا لانے کے بعد بلال نے آواز دی۔ "اس چٹان پر پاؤں رکھ کر دُوسری جگہ کُود جاؤ" ندیم بچ گیا تھا۔ اِس کے بعد ضرار کو بھی اُنھوں نے اسی طرح نکالا —

دلدل سے باہر آ کر دونوں نے اپنی ٹانگیں صاف کیں اور پھر چل کھڑے ہُوئے۔ دس قدم پرے پکّا راستہ تھا وُہ بڑی احتیاط سے قدم اُٹھا رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہُوئی تھی۔

"گھرررر گھررر" اچانک شاہین کے سٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور وُہ دونوں اُچھل پڑے۔ پھر اس گھبراہٹ پر دونوں ایک دُوسرے کی طرف دیکھ کر مُسکرائے۔

"کیپٹن، ہمیں اِن پتھروں سے جلد سے جلد نکل کر اِس
راستے پر پہنچنا چاہیے کیوں کہ یہی وُہ راستہ ہے جس پر آگے
جا کر چوٹی آتی ہے۔" ضرار بولا۔
"بیٹھ جاؤ۔" ندیم نے آہستہ سے کہا۔ دونوں ایک پتھر
کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ اُن کے قریب سے دو تِتلی
گزر رہے تھے اور چٹان کی جانب جا رہے تھے۔
"اِن کے ہاتھوں میں کیا ہے؟" ضرار نے پوچھا۔
"آہستہ بولو" ندیم نے کہا۔ "میرے خیال میں یہ نیلی
شعاعیں پھینکنے والی ٹارچیں ہیں اور یہ لوگ ہماری چٹان
کی طرف جا رہے ہیں۔"
"ایک دو تین ـــــ ڈز ڈز" ضرار نے بندوق چلائی
اور دونوں تِتلی خون میں لت پت تڑپنے لگے۔ ضرار اور
ندیم بھاگ کر اُن کی لاشوں کے پاس گئے اور اُنھیں گھسیٹتے
ہوئے پتھر کے پیچھے لے آئے۔ پہلے اُنھوں نے اُن کی
وردیاں اُتاریں اور پھر لاشوں کو دلدل میں پھینک دیا۔
اُن کی جیب سے ایک ایک ٹارچ نکلی۔ اُنھوں نے ٹارچ
کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اچانک ندیم کے
ہاتھ کو ایک جھٹکا لگا اور ڈبّا زمین پر گر گیا۔
"کیا بات ہے کیپٹن؟" ضرار نے خوف زدہ ہو کر

پوچھا۔
"میرا ہاتھ بے خبری میں کسی بٹن سے چھو گیا تھا۔"
ندیم نے کہا۔ "ٹارچ میں سے نیلی شعاع نکل کر میرے
ہاتھ پر لگی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہاتھ پر کسی نے
ہتھوڑا مار دیا ہو۔"
ندیم نے پھر ٹارچ اُٹھائی اور بڑی اِحتیاط سے اُس کا
جائزہ لینے لگا۔
تھوڑی دیر بعد ندیم خوشی سے چلّایا۔ "ضرار، مجھے ٹارچ
کے اِستعمال کا طریقہ معلوم ہو گیا ہے۔ دائیں طرف والے
بٹن کو دبانے سے شعاعیں نکلتی ہیں اور بائیں طرف والے
بٹن کو دبانے سے بند ہو جاتی ہیں۔" "یہ دیکھو۔" ندیم نے
شعاع کو نکال کر اور پھر بند کر کے دکھایا۔ اِس کے بعد
دونوں نے تِتلیوں کی وردیاں پہن لیں اور اپنے کپڑے
دلدل میں پھینک دیے۔
"آپ تو بالکل تِتلی معلوم ہوتے ہیں کیپٹن۔" ضرار نے
کہا۔
"اور تم بھی تو۔" ندیم نے مسکرا کر کہا۔
"کیپٹن۔ ذرا خیال رکھیے گا۔ کہیں مجھے تِتلی سمجھ کر
گولی کا نشانہ نہ بنا دیجیے گا۔" ضرار نے کہا۔

"ممکن ہے بھاگ دوڑ میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں اور جب دوبارہ ملیں تو دور سے پہچان نہ سکیں۔ آؤ ہم اپنی بائیں کلائی پر رومال لپیٹ لیں تاکہ فوراً پہچانے جا سکیں۔ ہم اِن کی ٹوپیاں بھی ذرا ٹیڑھی پہنیں گے کیوں کہ یہ تبتی ٹوپی کو سر پر بالکل سیدھا رکھتے ہیں" ندیم نے کہا۔

انھوں نے جھٹ پٹ اپنی بائیں کلائیوں پر سفید رومال لپیٹے اور ٹوپیاں سر پر ذرا ٹیڑھی کر کے رکھ لیں۔ اب وہ چوٹی کی طرف جانے والے راستے پر آ گئے تھے۔ فرار کچھ کہنے لگا تھا کہ ندیم نے اشارے سے اُسے چپ کرا دیا ___

"قدموں کی چاپ سنتے ہو؟ کوئی آ رہا ہے۔" ندیم نے کہا۔

کوئی پچاس ساٹھ تبتی ہاتھوں میں نیلی شعاعوں کی ٹارچیں لیے اُن کی طرف آ رہے تھے۔ ندیم نے رائفل مضبوطی سے پکڑ لیا اور آہستہ سے کہا۔ "فرار، بندوق کر اس پتھر کے پیچھے ہو جاؤ۔ میں اُن کا راستہ روکتا" اب تبتی بالکل قریب آ گئے تھے۔

"فائر!" ندیم نے چلّا کر کہا۔ اِدھر رائفل اور اُدھر دو

بندوق آگ اُگلنے لگی۔ دونوں نے پلک جھپکتے ہی دس بارہ تبتیوں کو زمین پر گرا دیا تھا۔ کچھ تبتی بھاگ رہے تھے۔ کچھ زمین پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ وادی گولیوں کی آواز سے گونج اُٹھی تھی۔ ندیم اور فرار لاشوں کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے۔ اچانک پیچھے سے کسی کے گھسٹنے کی آواز آئی۔ ندیم نے مڑ کر دیکھا اور ایک لمحے کے لیے اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ تین زخمی تبتی گھسٹتے ہوئے ندیم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں۔ ایک شعاع نکلی اور ندیم کے گھٹنے پر ہتھوڑے کی طرح لگی۔ "آہ" ندیم نے چیخ ماری اور زمین پر گر پڑا۔ اُس نے پھرتی سے رائفل کا رُخ ان تبتیوں کی طرف کر دیا تھا لیکن اس وقت تک ایک اور تبتی فرار پر شعاع گھما چکا تھا۔ "اُف، آہ" فرار نے چیخ ماری اور اُس کی بندوق ہوا میں اُچھل گئی۔ ندیم کی رائفل پھر شعلے اُگلنے لگی۔ زخمی تبتی مُنہ کے بل گرے اور تڑپنے سے پہلے ہی ٹھنڈے ہو گئے۔

"صبر کرو فرار" ندیم نے اس کو زمین پر سے اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ہمیں گھیرا ڈال کر گرفتار یا ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ اگر ہم صحیح وقت پر وہاں سے نکل آئے ہوتے تو خدا جانے کیا ہوتا۔"

اچانک خطرے کا سائرن بجنے لگا۔" میرے خیال میں
جو تنتنی یہاں سے بچ کر بھاگ گئے تھے اُنھوں نے اپنے
ساتھیوں کو اِطلاع کر دی ہے۔" ضرار نے کہا۔
"میرا خیال ہے کہ ہمیں اِن ٹارچوں سے کام لینا چاہیے"
ندیم نے کہا۔
"آہ" ضرار کے گھٹنے میں درد ہو رہا تھا۔
"میرا خیال ہے کہ اب ہزاروں تنتنی یہاں آ جائیں گے۔"
ندیم نے کہا۔ "ٹھہرو میں اِس پتھر پر چڑھ کر دیکھتا ہُوں۔"
"اوہ میرے خُدا" ندیم نے کہا۔ "یہ تو فوج کی فوج آ
رہی ہے۔ مجھے زندگی میں کبھی ایسی لڑائی پیش نہیں آئی۔
اِن کے پاس ٹارچیں بھی ہیں۔ آؤ ہم بھی ٹارچیں اکٹھی کریں۔"
دونوں مُردہ تنتنیوں کی ٹارچوں کو جلدی جلدی اُلٹ پلٹ
کر دیکھنے لگے۔ دس ٹارچیں بالکل صحیح حالت میں تھیں۔
ندیم نے کہا۔ "میں راستے کے دائیں طرف اِس پتھر کے پیچھے
رائفل لے کر بیٹھا ہُوں۔ تُم بائیں جانب اُس پتھر کے پیچھے
بیٹھو اور ٹارچوں کو ایک قطار میں لگا کر اُن کے مُنہ آنے
والے لوگوں کی طرف کر دو۔ جب میں فائر کھولوں تو تُم
پُھرتی سے اِن سب ٹارچوں کے بٹن دبا دبا کر شعاعیں اُن
پر پھینکنا شروع کر دینا۔"

ندیم بھاگ کر پتھر کے پیچھے چلا گیا۔ ضرار بھی ٹارچوں
کو ایک قطار میں لگا کر اِن کے مُنہ راستے پر لگا چُکا
تھا۔ فوج قریب آتی جا رہی تھی۔ ندیم بے چینی سے آنے
والوں کا اِنتظار کر رہا تھا۔ اب فوج راستے پر اُسی طرف
آتی ہُوئی دِکھائی دینے لگی تھی۔ ضرار نے ایک ہاتھ میں
بندُوق تھام رکھی تھی۔ دونوں مرنے مارنے پر تُل چکے تھے
اب تنتنی اِن سے دس قدم کے فاصلے پر آ پہنچے تھے۔ ندیم
سانس روکے بیٹھا تھا۔
"فائر" ندیم اچانک زور سے چلّایا۔ ڈز ڈز۔ ٹھائیں۔ ٹھائیں
ندیم کُود کر راستے پر آ گیا تھا۔ اِدھر اُس کی رائفل، ضرار کی
بندُوق اور نیلی شعاعوں نے تباہی مچا دی تھی۔ تنتنی گاجر مُولی
کی طرح گِر رہے تھے۔ چیخوں اور بندُوقوں کی آواز سے خوف
ناک سماں بندھ گیا تھا۔ دس منٹ تک تنتنی گرتے رہے۔
پھر بھاگ کھڑے ہُوئے۔ اب ضرار بھی دونوں ہاتھوں میں چار
ٹارچیں پکڑے پتھر سے نِکل کر راستے کے درمیان میں آ گیا تھا۔
"پیچھا کرو" ندیم نے بھاگتے ہُوئے تنتنیوں کے پیچھے
بھاگتے ہُوئے ضرار سے کہا۔ نیلی شعاعیں رائفل کی گولیوں سے
زیادہ کام کر رہی تھیں۔ دونوں اُن کے پیچھے بھاگتے ہُوئے
کافی دُور نِکل گئے۔

"میرے خیال میں ہم کافی دُور آ گئے ہیں — واپس چلنا چاہیے۔" ندیم نے کہا۔

سارا راستہ لاشوں سے پٹ گیا تھا۔ یہاں اُنھوں نے وُہی جھیل دیکھی جس کے نیچے دُنیا کا سب سے خطرناک اڈّا بنا ہُوا تھا۔ یہاں سے کوہِ نُور بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ نیلی شعاعوں والی چوٹی اب صاف دِکھائی دے رہی تھی۔ دونوں واپس آ رہے تھے۔ تبّتیوں کا پیچھا کرتے ہُوئے وُہ چوٹی سے آگے نِکل گئے تھے۔ اب وُہ واپس اُسی طرف جا رہے تھے۔

"ضرّار، اللہ نے ہمیں بُہت بڑی فتح دی ہے۔ لیکن ہمارا کام پُورا نہیں ہُوا۔ ہمیں نیلی شعاعوں والی ٹارچ کو ختم کرنا ہے اور یہ کام کم خطرناک نہیں ہے۔"

ندیم کے کندھے پر رائفل رکھی تھی اور ضرّار نے ایک ہاتھ میں دو ٹارچیں اور دُوسرے میں بندُوق تھام رکھی تھی۔

"آہ" ندیم کی چیخ فضا میں بُلند ہُوئی۔ ایک تبّتی کسی پتھر کے پیچھے چُھپا ہُوا تھا۔ اُنھیں واپس آتے دیکھ کر اُس نے ندیم پر نیلی شعاع پھینکی تھی۔ جو اُس کے بازُو پر لگی تھی۔ وُہ چیخ مار کر زمین پر گرا اور رائفل کندھے سے ڈھلک کر اُس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اُس تبّتی نے ایک اور شعاع ندیم پر پھینکی۔ ندیم نے رائفل چلانے کی کوشش کی۔ مگر شعاع

اُس کے گُھٹنے پر لگی۔ وُہ درد کی وجہ سے پھر چیخا اور رائفل اُس کے ہاتھ سے نِکل کر پرے جا گری۔ ایسا لگتا تھا، کہ تبّتی ندیم کو ختم کر دے گا۔ لیکن عین اُسی وقت ضرّار اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ اُس نے فوراً ہی اپنی ٹارچ کی شعاع تبّتی کے ہاتھ پر ڈالی اور وُہ اُچھل کر اوندھے مُنہ زمین پر گر پڑا۔ ایک اور شعاع اُس پر ڈالنا چاہتا ہی تھا کہ وُہ ایک دم اُٹھا اور دوڑ کر ضرّار سے لپٹ گیا۔ اِس وقت تک ندیم بھی سنبھل چُکا تھا۔ اُس نے اپنی رائفل کا دستہ تبّتی کے سر پر مارا مگر تبّتی نے اپنا سر ایک طرف کر لیا اور دستہ اُس کے سر کے بجائے کندھے پر لگا۔ ضرّار کی گردن اِس بھاری بھرکم تبّتی کے ہاتھوں میں تھی اور وُہ پُوری قوّت سے اُسے دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ندیم نے ایک وار اور کیا۔ تبّتی کے سر پر چوٹ لگی۔ وُہ چیخ مار کر اُٹھا اور ندیم کی طرف جھپٹا۔ ندیم کے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ تبّتی نے پُھرتی سے ٹارچ اُٹھائی۔ ندیم کے ہاتھ پر شعاع ڈالی۔ ندیم زمین پر لیٹ گیا۔ ضرّار بھی زور لگا کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور اُس نے اپنی بندُوق اُٹھا کر تبّتی پر فائر کر دیا۔ تبّتی چیخ مار کر زمین پر گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

ضرار زمین پر ادھ موا پڑا تھا۔ اُس کی گردن پر انگلیوں کے نشان تھے اور گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا۔ ندیم نے آگے بڑھ کر اُس کا سر گود میں رکھ لیا اور اُسے ہوش میں لانے کے لیے آوازیں دینے لگا مگر ضرار بے ہوش ہو چکا تھا۔

ندیم نے ضرار کو کندھے پر اُٹھا کر ایک پتھر کے پیچھے زمین پر لٹا دیا۔ پھر وُہ اپنی رائفل اور بندوق لینے کے لیے پگ ڈنڈی پر آیا۔ اچانک اُس نے دیکھا کہ دو تبّتی بڑی تیزی سے بھاگ رہے ہیں۔ ندیم تھک چُکا تھا مگر وُہ پھر لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اُس نے فوراً ٹارچ اُٹھا کر بھاگتے ہُوئے تبتیوں پر شعاع پھینکی مگر وُہ بہت دُور جا چُکے تھے۔ اُس نے دو ٹارچیں اُٹھائیں اور ضرار کے پاس آ کر اُسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ضرار نے آنکھیں کھول دیں۔

"ہیں — ہُوں؟ میں کہاں ہُوں؟" ضرار نے بڑبڑاتے ہُوئے کہا۔

"بولو مت" ندیم نے اُسے پیار سے چپت لگاتے ہُوئے کہا۔

"کہاں ہے وُہ بدمعاش؟ میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

ضرار نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔ ندیم مُسکرا دیا۔

"وُہ سامنے پڑا ہے۔" ندیم نے اُس کی طرف اِشارہ کر کے کہا۔

ندیم رائفل اُٹھا کر باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر ارد گرد پھیلی ہُوئی لاشوں کو غور سے دیکھنے اور تسلّی کر لینے کے بعد کہ ان میں کوئی زندہ نہیں، وُہ دونوں نیلی شعاعوں والی چوٹی کی طرف چل پڑے۔ کچھ دُور جا کر اُنھیں بائیں طرف ایک کچّا راستہ نظر آیا یہ راستہ چوٹی کو جانے والے دروازے پر ختم ہوتا تھا۔ دونوں اِسی طرف بڑھے۔

"ضرار، بندوق اور ٹارچوں کو تیار رکھنا۔ ہمیں اب آخری لڑائی لڑنی ہے۔ ہمیں چوٹی پر پہنچ کر سب سے بڑی مُصیبت یعنی سب سے بڑی ٹارچ توڑنا ہے۔"

"فکر نہ کیجیے کیپٹن، اِنشاء اللہ ہم کو فتح ہو گی۔" ضرار بولا۔ اچانک اُنھوں نے شاہین کی آواز سُنی۔

"کیپٹن، صُبح ہو چلی ہے۔ ہمیں جلد کام ختم کر لینا چاہیے۔" ضرار نے کہا۔ "شاہین اُسی میدان کی طرف جا رہا ہے جہاں ہم نے بِلال کو جانے کے لیے کہا ہے۔"

"ہاں" ندیم نے کہا اور وہ دونوں چوٹی پر جانے والے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کُھلا ہُوا تھا اور وہاں

کوئی شخص بھی نہیں تھا۔ بسم اللہ پڑھ کر ندیم نے سیڑھیوں پر
قدم رکھا۔

"ایک ٹارچ مجھے دے دو۔ ٹوپی ٹیڑھی کر کے پہن لو
تاکہ چہرہ چھپ جائے۔ ہم نے دشمن کی وردیاں پہن رکھی ہیں
پہلی نظر میں وہ ہمیں پہچان نہیں سکیں گے۔ خاموشی سے
میرے ساتھ ساتھ آؤ۔" ندیم نے کہا۔

دونوں سیڑھیاں چڑھتے رہے۔ ایک سو سیڑھیاں چڑھنے
کے بعد انھیں دو خالی کرسیاں نظر آئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے
ابھی ابھی یہاں سے کوئی اٹھ کر گیا ہے۔

"ہوشیار" ندیم نے آہستہ سے کہا۔ "جب تم بے ہوش
تھے تو دو تبتی بھاگ رہے تھے۔ میرے خیال میں وہ ہم
سے خوف زدہ ہو کر یہاں سے بھاگے ہیں۔"

ایک سو سیڑھیاں اور چڑھنے کے بعد انھیں دو تبتی
کرسیوں پہ بیٹھے نظر آئے۔ وہ تاش کھیل رہے تھے۔ انھوں
نے سر اٹھا کر دیکھا اور پھر کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔
قریب پہنچ کر ندیم نے ضرار کو اشارہ کیا اور دونوں ایک ہی
وقت میں ان پہ ٹوٹ پڑے۔ ندیم نے بڑے زور سے
رائفل کا دستہ ایک تبتی کے سر پہ مارا۔ اس کی چیخ نکلنے لگی
تھی کہ ندیم نے ایک دم اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا اور

نیچے گرا کر منہ میں رومال ٹھونس دیا۔ ادھر ضرار نے بھی دوسرے
تبتی کے سر پہ بندوق کا دستہ مار کر اسے بے ہوش کر دیا
تھا۔

دونوں پھر اوپر چڑھنے لگے۔ پچاس سیڑھیاں اور چڑھنے
کے بعد چوٹی ختم ہو گئی اور ایک چبوترا نظر آیا۔ سامنے دو
تبتی دوسری طرف منہ کیے کرسیوں میں بیٹھے تھے۔ چبوترے
پر کوئی بہت بڑی مشین چل رہی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ
ان کے قریب پہنچ گئے۔ مشین میں سے ہلکی ہلکی گھرر گھرر
کی آواز آ رہی تھی۔ ندیم نے ضرار سے کہا۔ "تم کچھ نہ کرنا۔
ان دونوں سے میں ہی نپٹوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے نشانہ لیا۔ رائفل میں سے ایک ایک
کر کے دو گولیاں نکلیں اور دونوں تبتی کرسیوں میں ہی ڈھیر
ہو گئے۔ کچھ دیر تک ضرار اور ندیم اس مشین کو دیکھتے رہے
پھر انھوں نے مشین کے تار کاٹے اس کے بعد ندیم نے
رائفل سے مشین پہ گولیوں کی بارش کر دی اور اس کے
کئی پرزوں اور شیشوں کو تباہ کر دیا۔ تھوڑی سی دیر میں
خطرناک شعاعیں پھینکنے والی یہ مشین تباہ ہو چکی تھی۔ جانے
سے پہلے ندیم نے دونوں جیبی ٹارچوں کے بٹن دبا کر مشین
کے اندر رکھ دیے۔

"آدھ گھنٹے میں یہ مشین بسکٹ کی طرح نرم ہو جائے گی۔" ندیم نے کہا۔ پھر دونوں سیڑھیاں اُترنے لگے۔

نیچے آکر اُنھوں نے کوہِ نُور کی طرف دیکھا۔ اُس کی روشنی بہت مدّہم ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ صُبح ہونے والی ہے۔ وُہ دونوں مُختلف راستوں سے ہوتے ہُوئے دو گھنٹے کے بعد اچانک اپنے ساتھیوں کے سامنے جا کھڑے ہُوئے۔

بلال نے ایک دم ریوالور نکال کر ندیم پر فائر کر دیا۔ ندیم اگر اُچھل کر پرے نہ ہٹ جاتا تو گولی اُس کا سینہ چیرتی ہُوئی نکل جاتی۔ ضرّار نے چلّا کر کہا۔ "بلال، یہ کیپٹن ندیم ہیں۔ یہ کیپٹن ندیم ہیں۔" بلال دُوسرا فائر کرنے ہی لگا تھا کہ ضرّار کی آواز پہچان کر رُک گیا۔ سب حیرت سے ندیم اور ضرّار کو دیکھنے لگے۔ ندیم آگے بڑھا اور بلال کے کان مروڑتے ہُوئے بولا۔ "تُم نے تو میری جان لے لی تھی۔"

بلال نے کہا۔ "ہم آپ کو تبتّی سمجھے تھے؟"

"خیر تُم نے ہوشیاری کا ثبوت دیا ہے۔" ندیم نے کہا۔ "یہ وردیاں تمھیں کہاں سے ملیں؟" چاچی نے حیران ہو کر پُوچھا۔

ندیم مُسکرایا اور پھر اُس نے شروع سے آخر تک اِس خطرناک سفر کی کہانی سنائی۔

گرفتاری

"اچھّا اب کُچھ پیٹ پُوجا کا بندوبست کیجیے۔" ندیم نے کہانی سُنانے کے بعد کہا۔ "ہمیں سخت بھُوک لگ رہی ہے"

"ہم ابھی آپ کے لیے ناشتا تیار کرتے ہیں۔" آصف نے کہا اور پھر وُہ اور بلال خیمے میں چلے گئے۔

"بھئی مُجھے سردی لگ رہی ہے۔" لالہ غنی نے کہا۔ "کیوں نہ خیمے کے اندر چلے جائیں۔ وہاں آگ بھی ہو گی۔"

سب اُٹھ کر خیمے میں چلے آئے۔ آصف اور بلال نے جلدی جلدی ناشتا تیار کیا اور سب کھانے میں مصرُوف ہو گئے۔ ناشتے کے دوران ندیم اُن کو اپنے واقعات سُناتا رہا۔ ضرّار چُپ چاپ بیٹھا ہُوا تھا۔ جب اُنھوں نے سُنا کہ نیلی روشنی پھینکنے والی سب سے بڑی مشین تباہ ہو گئی ہے تو سب نے اِطمینان کا سانس لیا۔

اب دُھوپ پھیل گئی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر

وہ سب باہر آ کر بیٹھ گئے۔ ضرار خیمے ہی میں رہا۔ رات بھر کی دوڑ دھوپ سے وہ سخت تھک چکا تھا اس لیے ناشتے کے بعد وہیں فرش پہ ہی سو گیا۔ ندیم اُسے سوتے ہوئے دیکھ کر مسکرایا اور چاچی سے کہنے لگا۔ "اِسے سونے دیں۔"

"نہیں۔" چاچی نے کہا۔ "ہم یہاں محفوظ نہیں ہیں۔ اِتنا نقصان اُٹھانے کے بعد یہ لوگ خاموش نہیں رہ سکتے۔ وہ ہمارا پیچھا کریں گے۔ اگر ضرار کو سونا ہی ہے تو جہاز کے اندر جا کر سوئے۔"

سب کو چاچی کی بات پسند آئی۔ اُنھوں نے ضرار کو جگانے کے لیے اُس کا کندھا ہلایا مگر وہ نہیں جاگا۔ اِس پر ندیم اور آصف نے مل کر اُسے اُٹھایا اور شاہین کے اندر جا کر لٹا دیا۔

"ہمیں واقعی دو تین میل دُور جا کر خیمہ لگانا چاہیے اِس طرح ہم تبتیوں کی پہنچ سے باہر ہوں گے۔" ندیم نے کہا۔

اُنھوں نے جلدی جلدی سب چیزیں سمیٹیں۔ جب ساری چیزیں جہاز کے اندر آ گئیں تو وہ بھی جہاز میں بیٹھ گئے۔ بلال اور ندیم پائیلٹ کے کمرے میں چلے گئے۔ بلال نے جہاز سٹارٹ کر دیا۔

"اُف میرے خدا" چاچی نے کھڑکی کے شیشے میں سے

دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم دو منٹ اور لیٹ ہو جاتے تو یہ تبتی ہم کو گرفتار کر سکتے تھے۔"

سب کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگے۔ جہاں اُن کا خیمہ تھا۔ وہاں زمین پھٹی ہوئی تھی اور نہ جانے کہاں سے اِتنے تبتی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ وہ جہاز کو حسرت سے اُڑتا ہوا دیکھ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں لوہے کے موٹے موٹے ڈنڈے تھے۔ بلال اُن سے دو تین میل دُور پہنچ کر جہاز کو ایک پہاڑی کے اُوپر لے گیا۔ قریب ہی ایک چوڑا سا میدان تھا۔

"میرے خیال میں یہ جگہ مناسب رہے گی۔ کافی چوڑا میدان ہے۔ جہاز یہاں اُتار لو۔" ندیم نے اِشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بلال نے شاہین کو دو تین چکر دیے اور پھر بڑی ہوشیاری سے ایک جگہ اُتار لیا۔ ضرار ابھی تک سویا ہوا تھا۔

عبدالغنی نے ندیم سے کہا۔ "آپ ساری رات جاگتے رہے ہیں۔ چند گھنٹے آرام کر لیں۔ میں اور آصف باہر جا کر پہرا دیتے ہیں۔ اگر کوئی خطرے کی بات ہوئی تو ہم آپ کو اطلاع دے دیں گے۔"

عبدالغنی اور آصف باہر نکل کر پہرا دینے لگے۔ غنی

کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور آصف کے ہاتھ میں بندوق ۔
تقریباً پانچ گھنٹے بیت چکے تھے ۔ عبدُالغنی اور آصف باتیں
کر رہے تھے ۔ اچانک آصف گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہُوا ۔

"غنی لالہ" آصف نے کہا ۔

"کیا ہے ؟" عبدُالغنی نے کہا ۔

"وُہ ۔ وُہ سامنے پہاڑی پر دیکھیے ۔ سفید سفید سے
نُقطے ہماری طرف آ رہے ہیں ۔" آصف نے کہا اور پھر
دونوں بڑے غور سے اس کی طرف دیکھنے لگے ۔ تھوڑی دیر
بعد پتا چلا کہ بگلے تھے ۔

اِتنے میں اُنھیں جہاز میں سے کُھسر پُھسر کی آوازیں سُنائی
دیں ۔ آصف نے مُڑ کر جہاز کی طرف دیکھا ۔ ندیم اور ضرّار جہاز
سے نیچے اُتر رہے تھے ۔ اُن کے پیچھے چاچی اور بلال تھے

"بہت بہت شکریہ" ندیم نے قریب آ کر کہا ۔

"معلوم ہے آپ کتنی دیر سوئے ؟" آصف نے گھڑی
دیکھتے ہوئے کہا ۔" پانچ گھنٹے اور دس منٹ تک ۔"

"اوہ" ندیم نے کہا ۔" ہم نے بہت سا وقت کھو دیا ۔
اب کچھ کرنا چاہیے ۔"

بلال کہنے لگا ۔" اب اور کیا کرنا باقی ہے ؟ میں تو کہتا
ہوں تھوڑا بہت ریڈیم لے کر واپس پاکستان لوٹ جائیں ۔

یہی ہمارا مقصد بھی ہے ۔"

"ٹھیک ہے ۔ ہمارا مقصد یہی تھا لیکن ذرا سوچو ۔" ندیم
نے کہا ۔" چند روز بعد یہ لوگ دُنیا کو تباہ کرنے کے لیے
نکل کھڑے ہوں گے ۔ جب اِنسان ہی نہیں رہیں گے تو ہم
خدمت کس کی کریں گے ؟ کیا اس صُورت میں ہمارا فرض
نہیں کہ ہم اِن کے اڈّے کو بالکل تباہ کر دیں ؟"

"تو اب کیا کیا جائے ؟" چاچی نے پُوچھا ۔

"میرے خیال میں سب سے پہلے ہمیں چاہیے کہ ریڈیم
حاصل کریں ۔ اڈّے کی تباہی کے بارے میں بعد میں سوچیں
گے ۔"

"تو گویا آج ہمیں کوہِ نُور پر جانا ہو گا ۔" ضرّار نے کہا ۔

"تُم ٹھیک سمجھے ہو ۔" ندیم نے مُسکرا کر کہا ۔

"کون کون جائے گا ؟" ضرّار نے پُوچھا ۔

"بس تُم اور میں ۔" ندیم بولا ۔" لیکن یہ تُم گھٹنے کو بار بار
دبا کیوں رہے ہو ؟"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں سُوئیاں سی کیوں چُبھ رہی
ہیں ۔" ضرّار نے کہا ۔

"ذرا کپڑا ہٹاؤ ۔" چاچی نے کہا ۔

ضرّار نے کپڑا ہٹایا ۔ اس کے گھٹنے پر نیلے رنگ کا نشان

تھا جو شاید تبتیوں کے ساتھ لڑائی میں پڑا ہو گا۔ آصف
نے ضرار کی نبض پر ہاتھ رکھ کر کہا "ہلکا ہلکا بخار بھی ہے"
پھر وہ شاہین کے اندر گیا اور تھوڑی دیر بعد دوا اور مرہم
لے آیا۔

"اِس مرہم کی گھٹنے پر دو دو گھنٹے بعد مالش کرو اور
دو گھنٹے بعد پانی کے ساتھ دو دو گولیاں کھاؤ ورنہ تمھیں
سخت بخار چڑھ جائے گا۔"

"شکریہ" ضرار نے مرہم اور گولیاں لیتے ہوئے کہا۔

"بس آج پانچ بجے شام کو ہم یہاں سے چل پڑیں گے"
ندیم نے کہا۔

"ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ کیوں نہ ہم اِتنی دیر میں یہاں
کے کچھ مقامات کی سیر کر لیں؟" بلال نے کہا۔

"تمھاری مرضی" ندیم نے کہا "لیکن بہت دُور نہ چلے
جانا۔"

ندیم اور ضرار جہاز کے قریب بیٹھ گئے اور پانچ بجے کی
مُہم کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ باقی چاروں چلے گئے۔
بلال اور چاچی کے ہاتھ میں ایک ایک بندوق تھی، اور
آصف کے پاس ریوالور تھا۔

دو گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا۔ اور وہ ابھی تک

واپس نہیں آئے تھے۔ آخر ندیم سے نہ رہا گیا۔ اُس نے ضرار
سے کہا "کوئی گڑ بڑ معلوم ہوتی ہے۔ وہ ابھی تک واپس
کیوں نہیں آئے؟"

ضرار بولا۔ "ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔"

"کرنا تو ضرور چاہیے" ندیم نے جواب دیا "لیکن جہاز
کا کیا کیا جائے؟"

"میرے خیال میں......" ضرار نے ابھی جملہ مکمل نہیں
کیا تھا کہ دُور کہیں گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ دونوں ایک
دم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دو آدمی اُن کی طرف بھاگے چلے آ
رہے تھے۔ اُنھوں نے غور سے دیکھا تو وہ غنی اور آصف تھے
اُن کے پیچھے کچھ تبتی لگے ہوئے تھے۔ ندیم اور ضرار بندوقیں
لے کر بے تحاشا بھاگے اور پانچ منٹ میں وہ اُن کے
پاس پہنچ گئے۔ آصف اور عبدُالغنی کی سانس پھُولی ہُوئی تھی
اور وہ بھاگنے میں بھی دقّت محسوس کر رہے تھے۔ اُن کے
پیچھے کچھ تبتی بھاگ رہے تھے جو اُنھیں گرفتار کرنا چاہتے
تھے۔ ندیم اور ضرار ایک پتھر کی اوٹ میں ہو گئے۔ کسی
کو بھی اُن کے آنے کا پتا نہ چلا۔ عبدُالغنی بھاگتے بھاگتے
زمین پر گر گئے اور دو تبتیوں نے اُنھیں پکڑ لیا۔ تین
تبتی آصف کی طرف لپکے۔ اُس نے ریوالور تان لیا اور گولی

چلانے لگا مگر ریوالور میں کوئی گولی نہ تھی۔ وُہ بھی گرفتار ہو گیا۔ کُل آٹھ تبتی تھے۔ بلال اور چاچی کا کُچھ پتا نہ تھا۔
ضرار نے بندوق تان کر نشانہ باندھا۔

"ٹھہرو" ندیم نے جلدی سے کہا "یُوں کام نہیں چلے گا۔ ہو سکتا ہے ہماری گولی ہمارے ہی آدمی کے لگ جائے پہلے لالہ غنی کو چھڑانے کی کوشش کرو۔ دائیں طرف والے آدمی کو میں اور بائیں طرف والے کو تُم قابُو میں کرو۔ تیار۔ ایک دو تین"

وُہ ایک دم پتھر کے پیچھے سے نکلے اور اُچھل کر اپنے اپنے شکار پر جا گرے۔ ان کی بندوقوں کے دستوں نے دونوں تبتیوں کو زمین پر گرا دیا۔ عبدُالغنی زمین پر گر گئے تھے۔ پھر دونوں بجلی کی طرح آصف کی طرف بڑھے۔ دو تبتیوں نے آصف کو پکڑے رکھا اور تیسرا ان کی طرف بڑھا لیکن اُسے ضرار کی گولی نے گرا دیا۔ پھر وُہ ان دونوں تبتیوں پر جھپٹے۔ ایک کے سینے میں گولی لگی اور وُہ مُنہ کے بل زمین پر گرا دُوسرا زخمی ہو گیا۔ اُس کی پنڈلی میں گولی لگی تھی۔ ندیم نے اُسے گرفتار کر لیا۔ یہ ایک بیس سالہ نوجوان تھا جس نے ریشمی قمیص پہن رکھی تھی۔ اِس کے بٹن سونے کے تھے۔ قمیص پر سُرخ رنگ کے پھول بنے ہُوئے تھے۔ ندیم

نے اُسے پکڑا ہی تھا کہ کسی پتھر کے پیچھے سے چار تبتی ایک دم کُود کر اس کی طرف بڑھے۔ لیکن ندیم اور ضرار کی گولیوں نے اِن سب کو بھُون کر رکھ دِیا۔ زخمی تبتی پھر بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ ضرار نے نشانہ باندھا لیکن ندیم نے اُسے روک کر کہا۔ "اِسے ہلاک مت کرو۔ زندہ پکڑو۔ زندہ"

ضرار اور ندیم دونوں اِس تبتی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں بھی لوہے کا ڈنڈا تھا۔ وُہ اُس کو ہوا میں ہلا ہلا کر اپنا بچاؤ کرنے لگا لیکن ندیم نے پُھرتی سے اُسے زمین پر پٹخنی دے کر گرفتار کر لیا۔

"بلال اور چاچی کہاں ہیں؟" ندیم نے آصف سے پُوچھا۔
جب عبدُالغنی نے بتایا کہ اِن دونوں کو تبتی گرفتار کر کے لے گئے ہیں تو وُہ بُہت گھبرایا۔

"کتنی دیر ہُوئی؟" ضرار نے پُوچھا۔

"تقریباً بیس منٹ" آصف نے جواب دِیا۔

اچانک سائرن بجنے کی آواز آئی۔ "یہ خطرے کا سائرن ہے۔" عبدُالغنی نے کہا۔

"چلو، اُس پتھر کے پیچھے چلیں۔" ندیم نے کہا۔ اور پھر زخمی تبتی کو سہارا دیتے ہُوئے وُہ پتھر کے پیچھے چلے گئے۔ بلال اور چاچی کی گرفتاری کا سُن کر سب کا دل

ڈوبنے لگا تھا مگر سب سے بُری حالت ندیم کی تھی۔ اُس
کی بے چینی دیکھی نہیں جاتی تھی۔

اچانک خطرے کا سائرن ایک بار پھر بجا۔ ندیم تھوڑی
دیر گم سُم رہا۔ پھر اُس نے مُٹھیاں بھینچتے ہُوئے اُونچی آواز
سے کہا۔ "اگر بلال اور چاچی کو کچھ ہو گیا تو میں اُس وقت
تک گھر نہیں جاؤں گا۔ جب تک اِن تبتیوں کا ایک ایک
آدمی نہ ختم کر دُوں۔"

ندیم کا چہرہ غُصّے سے سُرخ ہو گیا تھا۔ اِتنے غُصّے میں
اُسے پہلے کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ تیسری مرتبہ سائرن
پھر بجا۔

"کیپٹن، ضرور کوئی بات ہے۔" ضرار نے کہا۔

مگر ندیم اپنے خیالوں میں کھویا ہُوا تھا۔ اُس نے کچھ جواب
نہ دیا۔ وُہ بار بار اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔

"کون ہو تُم؟" اچانک ندیم نے رائفل کی نالی تبتی نوجوان
کے سینے پر رکھتے ہُوئے کہا۔ "اگر انھیں کچھ ہو گیا تو میں
تُمھاری نسل صفحۂ ہستی سے مٹا دُوں گا۔"

آصف نے چُپکے سے عبدُالغنی سے کہا۔ "ندیم ہوش میں
نہیں ہے۔ اِسے روکیں ورنہ کچھ کر دے گا۔"

"ٹھہرو، ندیم بیٹے، میں اِس سے بات کرتا ہُوں۔"

عبدُالغنی نے آگے بڑھ کر کہا۔ عبدُالغنی اور تبتی کچھ دیر تبتی زبان
میں باتیں کرتے رہے۔ تبتی کی آنکھوں میں آنسُو تھے۔

"کیا کہتا ہے؟" کچھ دیر بعد ندیم نے پُوچھا۔ اُس کے بال
بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے اور آنکھوں سے چنگاریاں نکل
رہی تھیں۔ "ذرا صبر کرو بیٹے۔" عبدُالغنی نے کہا۔ "بلال
اور تُمھاری چاچی دونوں زندہ ہیں۔"

"زندہ ہیں؟" ندیم نے ایک دم اُچھل کر کہا۔

"ہاں۔" عبدُالغنی نے کہا اور پھر تبتی سے باتیں کرنے
لگے۔ تھوڑی دیر بعد عبدُالغنی نے مُسکراتے ہُوئے کہا۔ "فکر
کی کوئی بات نہیں۔ یہ لڑکا یہاں کے سردار کا لڑکا ہے۔
اور اُس کی اکلوتی اولاد ہے۔ یہ کہتا ہے کہ سردار نے اپنے
آدمیوں کو حُکم دیا ہے کہ تُم کو ہلاک نہ کیا جائے بلکہ زندہ
گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جائے اور ساری عُمر عذاب
دیا جائے۔ اِن کا پہلے دِن کا عذاب یہ ہے کہ قیدیوں کو
ایک نہایت بدبُودار کوٹھڑی میں اُلٹا لٹکا دیتے ہیں، اور
پھر............"

"دھم دھم ——— دھم دھم ——— دھم دھم۔" سامنے والی
سڑک پر فوجیوں کے قدموں کی آوازیں آنے لگیں۔ ندیم ایک
دم پتھّر کے اُوپر چڑھ گیا۔ اِس کے ساتھ ہی عبدُالغنی بھی اُوپر

چلے گئے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ بُہت سے تبتی اِن کی طرف آ
رہے ہیں۔ اُن کے آگے آگے ایک آدمی سفید جھنڈا اُٹھائے
ہُوئے تھا۔

"کیپٹن" عبدُاغنی بولے۔" سفید جھنڈا تو صُلح کا نشان
ہوتا ہے۔"

"ہاں، لیکن یہ کہیں اُن کی چال نہ ہو۔" ندیم بولا۔"ضرار
بندُوق میں کارتوس بھر لو اور اِس تبتی کے ہاتھ مضبوطی سے
باندھ دو۔"

"اچھا کیپٹن۔" ضرار نے کہا۔

عبدُاغنی خوشی سے چیخ کر بولے۔" چاچی اور بلال بھی
اُن کے ساتھ ہیں۔"

ندیم نے ضرار سے کہا۔" ہو سکتا ہے اِن لوگوں کے آگے
نظر نہ آنے والے آدمی ہوں۔ اگر تُم کوئی پتھر ہلتے دیکھو تو
گولی چلا دینا۔ آصف تُم اِس لڑکے کا خیال رکھنا۔"

ندیم نے رائفل کا رُخ آتے والے تبتیوں کی طرف پھیر
دیا۔ وُہ لوگ اُن سے پچاس گز کے فاصلے پر آ کر رُک گئے
ایک آدمی آگے بڑھا اور بیس گز کے فاصلے پر آ کر اُس
نے تبتی زبان میں کچھ کہا۔

"کیا کہتا ہے غنی لالہ؟" ندیم نے پُوچھا۔

"یہ کہتا ہے، ہمارے سردار چنگ فرنگ کا لڑکا ساکینگ
آگفینگ آٹھ نو آدمیوں کے ساتھ تُمھاری طرف آیا تھا۔ اب
ہمیں اِطلاع ملی ہے کہ وُہ تُمھاری قید میں ہے — ہمارے
سردار اُسے واپس حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ لڑکا آپ
کے پاس ہے؟"

اب ندیم اور تبتیوں کے درمیان عبدُاغنی کے ذریعہ بات
چیت ہونے لگی۔

ندیم نے کہا۔" کیا اِس لڑکے کی قمیص ریشمی ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔" تبتی کا جواب آیا۔

"اِس پر سُرخ رنگ کے پھُول کڑھے ہُوئے ہیں؟"

"ہاں۔ ہاں۔"

"اُس نے سبز ہیرے کی انگوٹھی پہن رکھی ہے؟"

"ہاں۔ ہاں۔"

"تو پھر یہ لڑکا ہمارے پاس ہے۔" ندیم نے مُسکراتے
ہُوئے کہا۔

"کیا وُہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے؟" تبتی کی آواز آئی۔

"نہیں۔ اُس کی پنڈلی میں گولی لگی ہے۔" ندیم نے کہا۔

"زخم بُہت خطرناک تو نہیں؟" تبتی نے گھبرائی ہُوئی
آواز میں کہا۔

"خُون بہہ رہا ہے ۔ علاج نہ کیا گیا تو ممکن ہے مَر جائے ۔" ندیم نے کہا ۔

یہ سُن کر تبتیوں میں کھُسر پھُسر ہونے لگی ۔ پھر آواز آئی ۔

"اِس لڑکے کو فوراً چھوڑ دیا جائے ۔"

ندیم بولا ۔ "اِس کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا ۔"

"آپ کا ایک آدمی ہم چھوڑ دیں گے ۔" آواز آئی ۔

"نہیں ۔ دونوں آدمی چھوڑنے ہوں گے ۔ ورنہ تم جا سکتے ہو ۔" ندیم نے کہا ۔

"ایک کے بدلے صرف ایک ۔" آواز آئی ۔

"زیادہ باتوں کی ضرورت نہیں ۔ منظور ہے تو ٹھہرو ورنہ تم جا سکتے ہو ۔" ندیم نے کہا ۔

تھوڑی دیر پھر کھُسر پھُسر ہوئی ۔ اُس کے بعد آواز آئی

"ہمیں منظور ہے ۔"

"تو پھر تم سب واپس چلے جاؤ ۔ صرف چار آدمی رہ جائیں ۔ اُن کے ساتھ ہمارے دونوں آدمی بھی ہوں ۔ یہ لوگ پچاس گز کے فاصلے پر کھڑے ہو جائیں ۔ پھر دو آدمی آگے بڑھیں اور ایک چارپائی پر اِس لڑکے کو لِٹا کر لے جائیں ۔"

سب تبتی واپس چلے گئے ۔ صرف چار پچاس گز کے

فاصلے پر چاچی اور بلال کو پکڑے کھڑے رہے ۔ پھر اُن میں سے دو آگے بڑھے ۔ اُنھوں نے شہزادہ سائکینگ آگفینگ کو چارپائی پر بٹھایا اور جب وُہ واپس مُڑ کر دس قدم تک گئے تو اُنھوں نے چاچی اور بلال کو چھوڑ دیا ۔

عجیب پھول

بلال نے اپنی اور چاچی کی گرفتاری کی کہانی سُنانا شروع کی - "بات یہ ہُوئی کہ میں چاچی، آصف اور لالہ غنی سیر کرتے ہُوئے یہاں سے کافی دُور نکل گئے - موسم بڑا خُوش گوار تھا - ہم ایک ٹیلے پر بیٹھ گئے - ہم نے دیکھا کہ تھوڑی دُور سُرخ رنگ کا کھیت ہے اور اِس کے ساتھ ہی اُتنا ہی بڑا ایک نیلے رنگ کا کھیت ہے -

ہم جاننا چاہتے تھے کہ یہ کیا چیز ہے - چاچی اور لالہ غنی نے ہمیں جانے سے منع کیا مگر میں نے اور آصف نے ضد کی - ہمارے پاس ریوالور اور بندوق بھی تھی - اِس لیے ہم بے خوف تھے - لالہ غنی اور چاچی سے ہم نے کہا کہ آپ اِس ٹیلے پر بیٹھیں ہم ابھی آتے - چاچی نے کہا کہ ہم دونوں بُوڑھے ہیں اور ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے - اِس لیے ہم بھی ساتھ ہی چلیں گے - چنانچہ ہم سب سُرخ اور

نیلے کھیتوں کی طرف چل پڑے - پہلے ہم سُرخ کھیت میں گئے - اِس میں لالہ کے پھول کِھلے ہُوئے تھے اور سُرخ رنگ کے پیالے معلوم ہوتے تھے - ہر پھول کے اندر مٹر کے دانے کے برابر ایک ایک سُرخ دانہ تھا - یہ دانے بے حد چمکیلے اور شیرے سے بھرے ہُوئے تھے - سُرخ کھیت کے ساتھ ہی نیلے پھولوں کا کھیت تھا - ہم اُس میں داخل ہُوئے تو وہاں بھی ہمیں لالہ کے پھول نظر آئے مگر یہ پھول نیلے رنگ کے تھے - ان پھولوں کے اندر بھی ایک ایک نیلے رنگ کا دانہ تھا - حیرت انگیز چیز یہ تھی کہ نیلے دانے پھولوں کے اندر چکّر کاٹ رہے تھے "

"چکّر کاٹ رہے تھے ؟ — خواب تو نہیں سُنا رہے؟" ندیم نے کہا -

"کیپٹن" بلال نے کہا "اگر یہ بات میں اکیلا دیکھتا تو خُود اپنے آپ پر مجھے یقین نہ آتا مگر اِس چیز کو آصف، لالہ غنی اور چاچی نے بھی دیکھا ہے "

"ہاں - ہم نے خُود نیلے دانوں کو پھولوں میں چکّر لگاتے دیکھا ہے " چاچی بولے -

"یہاں کی ہر چیز عجیب ہے " ندیم نے کہا " پھر کیا ہُوا ؟ "

بلال نے کہا: "پھر ہم سُرخ کھیت میں واپس آ گئے۔ تاکہ دیکھیں کہ سُرخ دانے بھی چکّر لگاتے ہیں یا نہیں۔"

"کیا وُہ چکّر لگا رہے تھے؟" فرّار نے پُوچھا۔

"نہیں۔ وُہ چکّر نہیں لگا رہے تھے" بلال نے جواب دیا "پھر میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک دانہ سُرخ پھُول سے نِکالا۔ وُہ رس سے بھرا ہُوا تھا۔ دانے کو بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھ کر میں نے دائیں ہاتھ کے انگُوٹھے سے دبایا تو اُس میں سے سُرخ رنگ کا رس نِکلا۔ یہ رس خُوشبُودار اور میٹھا تھا۔ معلُوم نہ ہو سکا کہ یہ کیا چیز ہے۔ اچانک آصف نے میرا کندھا ہِلا کر کہا کہ لالہ غنی کی طرف دیکھو۔ لالہ غنی سُرخ کھیت کے اندر چلے گئے تھے اور جیب سے رُومال نِکال کر اُس میں سُرخ دانے جمع کر رہے تھے۔ میں نے حیران ہو کر لالہ غنی سے پُوچھا کہ آپ اِن دانوں کو کیوں جمع کر رہے ہیں؟ مگر اُنھوں نے مُڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ہم نے اُنھیں زور زور سے آوازیں دیں۔ مگر اُن پر تو جیسے نشہ چڑھا ہُوا تھا۔ آصف کھیت کے اندر گیا اور اُن کا کندھا ہِلایا مگر وُہ دانے جمع کرتے رہے۔ آخر ہم سب کھیت کے اندر چلے گئے اور اُنھیں کھیت سے باہر لے آئے۔ وُہ گُم سُم سے تھے۔ ہم نے بار بار اُنھیں پُکارا مگر اُنھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پہلے وُہ چُپ چاپ کھڑے

تھے۔ پھر اُن کا جسم کانپنے لگا اور اُنھوں نے رونا شرُوع کر دیا۔ اچانک اُنھوں نے رُومال کے سارے دانے کھیت میں پھینک دیے۔

میں نے بہت زور دیا تو لالہ غنی نے بس اِتنا کہا "مُجھے کھیت سے پرے رکھو اور کسی صُورت میں بھی سُرخ دانے کھانے نہ دینا۔" ہم اُنھیں کھیت سے باہر لے آئے۔ پھر میں نے آصف سے کہا کہ تُم لالہ غنی کے پاس ٹھہرو۔ اُنھیں دوبارہ سُرخ کھیت میں نہ جانے دینا۔ میں اور چاچی نیلے کھیت میں آ گئے۔ نیلے دانے اُسی طرح پیالوں میں چکّر لگا رہے تھے۔ میں نے ایک دانہ نِکالا تو اچانک پِچھلی طرف کسی کی آہٹ سُنائی دی۔ میں نے گردن گھُما کر دیکھنا چاہا مگر کوئی شخص نظر نہ آیا چاچی بھی غائب تھے۔ اب مُجھے سخت سردی لگنے لگی تھی۔ میں نے اپنے قریب ہی ایک سفید بادل دیکھا۔ اچانک میرے مُنہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا اور میرے ہاتھ جکڑ لیے۔ میں چِلّانا چاہتا تھا مگر مُنہ میں کپڑا ٹھُنسا ہُوا تھا۔ پھر کسی شخص نے مُجھے اپنی پیٹھ پر لادا اور اڈّے کی طرف چل پڑا۔ آصف اور لالہ غنی باتیں کر رہے تھے۔

"مُجھے بعد میں پتا چلا کہ نیلے کھیت میں دو تبّتی پہرے دار موجُود تھے۔ اُنھوں نے نظروں سے غائب ہو جانے والی دوا

پی رکھی تھی۔ پہلے تو اُنھوں نے چاچی کو گرفتار کیا اور پھر مُجھے۔ اِس کے بعد وُہ ہم دونوں کو اڈّے ہیں لے گئے۔"

"اُنھوں نے آصف اور لالہ غنی کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟" فرّار نے پُوچھا۔

"اِس لِیے کہ وُہ صِرف دو تھے۔ اُن کا اِرادہ شاید یہ تھا کہ پہلے مُجھے اور چاچی کو گرفتار کریں گے۔ پھر ہمیں اڈّے ہیں چھوڑ آنے کے بعد آصف اور لالہ غنی کو گرفتار کر کے لے جائیں گے ایک دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ نظر نہ آنے والا سفید بادل نیلے بادل ہیں تبدیل ہونا شرُوع ہو گیا۔ جب یہ لوگ دوا پیتے ہیں تو پہلے اُن کے چاروں طرف ایک سفید بادل بنتا ہے اور سخت سردی ہو جاتی ہے۔ اِس بادل ہیں جو شخص یا چیز بھی آ جائے۔ وُہ بھی نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ پھر ایک دو منٹ بعد یہی بادل نیلا ہونا شرُوع ہو جاتا ہے اور سردی گھٹ جاتی ہے۔ جب اُنھوں نے ہمیں گرفتار کیا تھا تو اس وقت بادل کی رنگت سفید تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لالہ غنی اور آصف ہمارے سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہے مگر وُہ ہمیں دیکھ نہ سکے۔

خیر، پھر وُہ ہمیں چنگ فرنگ کے دربار ہیں لے گئے۔ اُس نے ہمیں جیل ہیں بند کرنے کے لِیے کہا اور ہم ایک

نہایت بدبُودار کمرے میں بند کر دیے گئے۔ ہمارے ہاتھ پاؤں
کھول دیے گئے تھے اور مُنہ سے کپڑا بھی نکال لیا گیا تھا۔

دُوسرے دِن ہمیں عذاب دیا جانا تھا۔ لیکن خُدا جانے اِن کے جی میں کیا آئی کہ وُہ ہمیں جیل سے نکال کر ایک جلُوس کی شکل میں لے کر چل پڑے اِس کے بعد جو کچھ ہُوا وُہ آپ جانتے ہی ہیں۔

"ہاں مجھے ایک بات اور یاد آئی۔ جب ہمیں گرفتار کر کے چنگ فرنگ کے پاس پیش کیا گیا تو اُس خبیث نے میرے بال کھینچے اور دھکّا بھی دیا۔ میں خُون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو رہا۔ جب چنگ فرنگ کے لڑکے ساکینگ ماکفینگ کو پتا چلا کہ کھیتوں کے قریب دو اور آدمی بھی ہیں تو اُس نے اپنے باپ سے اِجازت لی کہ وُہ اُنھیں خُود گرفتار کرنے کے لیے جائے گا۔ پہلے تو چنگ فرنگ نہ مانا لیکن بعد میں مان گیا اور شہزادے کے ساتھ چار پانچ اور آدمیوں کو بھی روانہ کر دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وُہ آصف اور لالہ غنی بتا سکتے ہیں۔"

"پھر کیا ہُوا غنی لالہ؟" ندیم نے پُوچھا۔

عبدُالغنی نے کہا: "جب ہم باتیں کر رہے تھے تو ہمیں چند آدمیوں کے قدموں کی چاپ سُنائی دی مگر وُہ دِکھائی نہ دِیے۔ چاچی اور بلال بھی غائب تھے۔ ہمیں خوف محسُوس ہُوا

خیال آیا کہ اُنھیں پہلے اُسی جگہ دیکھ لیا جائے جہاں وُہ کھڑے تھے۔ ہم نے نیلے کھیت میں ڈھونڈا مگر وہاں کوئی نظر نہ آیا دس پندرہ منٹ گُزر گئے۔ پھر میں نے آصف سے کہا کہ تم سُرخ کھیت میں جاؤ۔ میں وہاں نہیں جا سکتا تھا۔"

"آپ کیوں نہیں جا سکتے تھے؟" ندیم نے پُوچھا۔

"ابھی بتاتا ہُوں۔" عبدُالغنی بولے۔ "آصف سُرخ کھیت میں گیا اور اُنھیں ڈھونڈتا رہا مگر وُہ نہ مِل سکے۔ وُہ جھنجلا کر ایک ایک پودے کو اُلٹ پُلٹ کرنے لگا۔ بے شمار دانے زمین پر بکھر گئے۔ میں نیلے کھیت میں کھڑا تھا۔ اچانک میرا پاؤں لگنے سے ایک پودے میں سے نیلا دانہ زمین پر گر پڑا۔ میں نے دیکھا کہ وُہ زمین پر گر کر پہلے تو تھوڑی دُور تک لُڑھکتا چلا گیا پھر پھٹ گیا اور اُس میں سے نیلی روشنائی کی طرح کا پانی نکلا۔ یہ نیلا پانی آہستہ آہستہ سفید دُھواں بنا اور پھر دو تین منٹ کے بعد یہی سفید دُھواں نیلا ہو گیا۔

میں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے چند نیلے دانے توڑے اور ہتھیلی پر اُن کا پانی نکالا تو میرے ہاتھوں پر سے سفید دُھواں نکلا۔ اُس کے ساتھ ہی میرا ہاتھ نظروں سے غائب ہو گیا۔ پھر بعد میں یہی سفید دُھواں نیلا ہو گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ دانے کہیں وہی نہ ہوں جن کے عرق کو پی

کر یہ تبتی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ میں نے چند اور
دانے چُن کر اِن کو ہاتھوں اور پاؤں پر ملا۔ میرے ہاتھ اور
پاؤں فوراً غائب ہو گئے۔ میری خوشی کی کوئی حد نہیں تھی کیوں
کہ آج پچّاس سال کے بعد مُجھے اِس راز کا پتا چلا تھا۔ میں
نے جیب سے رُومال نکال کر نیلے دانے جمع کرنے شروع کر
دیے مگر وُہ پھول سے جُدا ہوتے ہی پھٹ جاتے تھے۔ افسوس
میرے پاس کوئی بوتل نہ تھی۔

پھر مُجھے آصف کا خیال آیا۔ میں اُسے آواز دینے لگا۔
اِتنے میں دُور سے مُجھے سات آٹھ تبتی اِسی طرف آتے نظر آئے
اِدھر میں نے دیکھا کہ آصف سُرخ کھیت میں بے ہوش پڑا
ہے۔ میں چُھپتا چُھپاتا آصف تک پہنچ گیا۔ پھر اُسے گھسیٹ کر
نیلے کھیت میں لے آیا۔ وُہ آدمی اِسی کھیت کی طرف آ رہے
تھے۔ مُجھے اور تو کُچھ نہ سُوجھی۔ میں نے نیلے دانے جمع کر کے
اُن کے پانی کو اپنے اور آصف کے جسم پر ملنا شروع کر دیا
وُہ آدمی اب ہمارے قریب آ گئے تھے مگر اب ہم دونوں اُن
کی نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔

اب مَیں نے دوڑ دوڑ کر دانے جمع کرنے شروع کر دیے
اور اُنھیں اپنے اور آصف کے جسم پر ملنے لگا۔ اِس سے پہلے
کہ ہمارا سفید دُھواں نیلے دُھوئیں میں بدلتا میں اور دانے لا

کر اپنے اور آصف کے جسموں پر مل دیتا۔ اِس طرح دو گھنٹے
بیت گئے۔ پہلے تو وُہ لوگ ہمیں سُرخ کھیت میں ڈھونڈتے
رہے پھر بعد میں نیلے کھیت میں آ گئے۔ اُنھوں نے لاکھ سر
پٹکا مگر ہم نظر نہ آئے۔ پھر وُہ کھیتوں سے باہر نکل آئے اور
تھوڑی دیر تک آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ اِدھر میں
نے آصف کو ہوش میں لانے کی کوشش کی اور آخر اُسے
ہوش آ گیا۔ میں نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا ہُوا تھا کیوں
کہ وُہ مُجھے بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہوش میں آتے ہی جب
اس نے گردن پر ہاتھ محسُوس کیا تو اُس کی چیخ نکل گئی —
میں نے اپنا مُنہ اُس کے کان کے قریب لے جا کر کہا —
"ڈرو نہیں۔ میں ہُوں تُمھارا غنی لالہ۔" اُس نے کہا کہ آپ
مجھے نظر کیوں نہیں آتے تو میں نے ساری بات اُسے سمجھا
دی۔ آصف کی چیخ سُن کر وُہ لوگ پھر ہماری طرف بڑھے۔
چند منٹ پہلے جب وُہ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے
تو ایک تبتی بستی کی طرف چلا گیا تھا جب وُہ ہماری طرف
بڑھے تو میں نے آصف سے کہا کہ وُہ بھی نیلے دانے اکٹھے کر کے
اپنے بچاؤ کی کوشش کرے۔ کیوں کہ میں اب تھک چکا ہُوں۔
اس کے بعد میں نے آصف سے کہا کہ تُمھارا ریوالور کہاں
ہے؟ اُس نے سُرخ کھیت کی طرف اِشارہ کیا۔ میں سُرخ کھیت

میں گیا مگر ریوالور نہ مِل سکا۔ آصف نیلے دانے اپنے جسم پر
ملتا ہُوا خُود سُرخ کھیت میں ریوالور ڈھونڈنے گیا۔ مگر وُہ نہ
مِل سکا۔ اِدھر نیلے کھیت میں اب بُہت کم دانے رہ گئے
تھے۔ اگر اُس وقت ہمیں ریوالور مِل جاتا تو اُن میں سے کوئی
بھی زندہ بچ کر نہ جاتا۔

اچانک میں کیا دیکھتا ہُوں کہ بستی کی طرف جانے والا تبّتی
واپس آ رہا ہے اور اُس کے ہاتھ میں ایک ڈرم ہے۔ جب
وُہ اپنے ساتھیوں کے پاس آیا تو شہزادہ ساکینگ آکفینگ
نے ڈرم کھولا اور اُس میں سے سفید پاؤڈر کی مُٹھیاں بھر بھر
کر سُرخ کھیت میں پھینکنے لگا۔ اس وقت تک آصف کو
ریوالور مِل چُکا تھا مگر جب اُس نے چلانے کی کوشش کی تو
وُہ جام ہو گیا۔ خیر اب آصف میرے پاس نیلے کھیت میں
آ چُکا تھا۔

کُچھ دیر وُہ لوگ سُرخ کھیت میں پاؤڈر گراتے رہے۔
پاؤڈر جہاں جہاں گرتا وہاں سفید شُعاعیں پیدا ہوتیں اور ہر
طرف روشنی پھیل جاتی۔ پھر اُنھوں نے نیلے کھیت میں پاؤڈر
پھینکنا شروع کیا۔ ایک مُٹھی پاؤڈر میرے قریب آ گرا۔ اس
میں سے شُعاعیں نکلیں اور میرے جسم پر ملے ہُوئے نیلے پانی
کا اثر ختم ہو گیا۔ اب میرا جسم نظر آنے لگا تھا۔ میں ایک دم

دُبک گیا۔ دُوسری طرف یہی بات آصف کو پیش آئی۔ سفید پاؤڈر
کی روشنی سے اس کا جسم بھی نظر آنے لگا تھا۔

تبّتی ہماری طرف بڑھے۔ آصف نے بے خیالی میں ریوالور
کا گھوڑا دبایا تو اس میں سے گولی نکلی مگر نشانہ خطا گیا۔ میرے
خیال میں ریوالور سفید پاؤڈر کی وجہ سے دوبارہ کام کرنے لگا
تھا۔ اب میں اور آصف دونوں گھیرے میں آ چُکے تھے۔ خیر
ہم نے دوڑ لگا کر کھیت سے باہر نکلنے کی کوشش کی مگر میں
پکڑا گیا۔ آصف نے ریوالور سے فائر کیے مگر افسوس کہ ساری
گولیاں بے کار گئیں۔ اِتنے میں تبّتی آصف کے پاس پہنچ چُکے
تھے اور اُنھوں نے آصف کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ جب وُہ
ہمیں لیے جا رہے تھے تو فائرنگ کی آواز سُن کر آپ لوگ
وہاں پہنچ گئے۔ باقی باتیں آپ جانتے ہی ہیں۔"

عبدُالغنی اپنی کہانی سُنا کر خاموش ہو گئے تو ندیم نے پُوچھا
"آپ سُرخ کھیت میں جا کر کانپنے کیوں لگے تھے؟"

"دراصل یہ سُرخ دانے وہی ہیں۔ جن کا عرق یہ لوگ
مُجھے پلایا کرتے تھے۔ جب میں کھیت میں پہنچا تو اِن دانوں
کی خوشبُو سے مُجھ پر نشہ طاری ہونے لگا۔ میرا دِل چاہا کہ
سارے دانوں کا عرق نکال کر پی جاؤں۔ اِسی لیے میں نے
رُومال میں یہ دانے اکٹھے کرنے شروع کر دیے تھے۔ پھر

مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے دوبارہ یہ نشہ شروع کر دیا تو میں
مر جاؤں گا اور آصف کی ساری محنت ضائع جائے گی ۔ خُدا
کا شکر ہے کہ آصف ، بلال اور آپ کے چاچی کی وجہ سے
میں بچ گیا ۔ میرے آنسو اسی لیے نکلے تھے کہ میں اس نشے
کے آگے اپنے آپ کو بے بس سمجھ رہا تھا ۔"

"اور آپ بے ہوش کیوں ہُوئے تھے ؟" ندیم نے آصف
سے پوچھا ۔

" اوہ ۔" آصف بولا ۔" میں جب سُرخ کھیت میں داخل
ہُوا تو میں نے سُرخ دانے اکٹھے کرنے شروع کر دیے ۔ لالہ
غنی نے کہا تھا کہ انھیں سُرخ دانے نہ کھانے دیے جائیں ۔ یہ
بات میرے ذہن میں تھی ۔ مجھے جڑی بُوٹیوں کا شوق ہے ۔
اس لیے میں نے سوچا کہ ان دانوں کو ضرور چکھنا چاہیے ۔
میں نے چند دانے کھا لیے ۔ پہلے تو میں اُونگھنے لگا اور پھر
بے ہوش ہو گیا ۔"

" عجیب پھول ہیں یہ ۔" ندیم نے کہا ۔

" افسوس آپ لوگوں نے سارے نیلے دانے ضائع کر دیے
ورنہ ہم بھی ایک دو کو آزما کر دیکھتے ۔"

" حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے ۔" لالہ غنی نے کہا ۔

" میں نے سُنا ہے کہ یہ تبتی نیلے پودوں کو پانی دینے کے بجائے

پسا ہُوا ریڈیم دیتے ہیں ۔"

ندیم نے کہا ۔" شام ہو گئی ہے ۔ ہمیں آج ایک اہم کام
کرنا ہے ۔ کھانا کھانے کے بعد ضرار اور میں کوہِ نُور سے ریڈیم
لینے جائیں گے ۔ آپ رات کو یہیں میدان میں خیمہ لگا کر
سوئیں گے یا جہاز کے اندر ؟"

" رات کو سردی بُہت ہو جاتی ہے اس لیے ہم جہاز ہی
میں سوئیں گے ۔" چاچی نے کہا ۔" لیکن سب ایک ساتھ نہیں
سوئیں گے ۔ مُمکن ہے رات کے وقت ہمیں غافل دیکھ کر
وُہ لوگ حملہ کر دیں ۔"

" میں اور غنی لالہ رات کے پہلے حصّے میں جاگیں گے ۔
پھر ہم سو جائیں گے اور بلال اور چاچی صُبح تک پہرا دیں
گے ۔" آصف نے کہا ۔

" بالکل ٹھیک ۔" چاچی نے کہا ۔

ڈولتی چٹان

چھ بج رہے تھے۔ ندیم نے رائفل میں گولیاں بھر لی تھیں۔ فرّار نے بھی کارتوسوں کی پیٹی گردن کے گرد ڈال لی تھی۔ دونوں کوہِ نور کی طرف چل پڑے۔ جانے سے پہلے اُنھوں نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں پر اچھی طرح دافعِ برق پانی ملا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ کوہِ نور سے شعاعیں نکلنے کا وقت ہونے والا تھا۔

"کیپٹن!" فرّار نے راستے میں پوچھا۔ "کوہِ نور کتنی دور ہو گا؟"

ندیم نے کہا۔ "تین میل سے کم کیا ہو گا۔ یہ سفر بہت خطرناک ہے۔ اگر تمھیں ڈر لگتا ہے تو یہیں سے واپس ہو جاؤ۔ میں ریڈیم لینے کے لیے ہی نہیں جا رہا بلکہ اڈّے کو تباہ کرنا میرا اصل مقصد ہے۔"

"کیپٹن، انسانوں کو ان وحشیوں سے بچانے کے لیے اگر

میری جان بھی چلی جائے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔" فرّار نے بڑے جوش کے ساتھ کہا۔

"شاباش۔ میرے شیر! مجھے تم سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔" ندیم نے فرّار کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ وہ نہایت احتیاط سے راستہ طے کر رہے تھے۔

آخر اونچے نیچے ٹیلوں سے ہوتے ہوئے وہ کوہِ نور کے قریب پہنچ گئے۔ اب وہ ایک بڑے سے ٹیلے پر کھڑے تھے۔ اُنھوں نے دائیں طرف نظر ڈالی۔ نیچے جھیل تھی۔

"میں حیران ہوں کہ ان لوگوں نے اتنی بڑی جھیل بنائی کیسے؟" فرّار نے کہا۔

"اس سے بھی حیران کن بات یہ ہے کہ جھیل کے نیچے ہی اُن کا اڈّا ہے۔" ندیم نے کہا۔

"یہاں سے جھیل کتنی نیچی ہو گی۔" فرّار نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کم از کم ایک ہزار فٹ نیچی ہے۔"

دونوں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھایا ہی تھا کہ فرّار ٹھٹک کر کھڑا ہو گا۔

"کیا بات ہے؟" ندیم نے پوچھا۔

"اُوپر دیکھیے!" فرّار نے گھبرا کر کہا۔

ندیم نے اُوپر نظر اُٹھائی تو اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک لاکھوں ٹن وزنی چٹان، جو اُوپر کی طرف سے ایک بہت بڑا گولا معلوم ہوتی تھی، اُن کے سر کے عین اُوپر موجود تھی۔ اس چٹان کی چوڑائی نیچے آکر بہت کم رہ گئی تھی۔ جس جگہ وُہ زمین سے جُڑی ہُوئی تھی وہاں اُس کا گھیر پانچ چھ فُٹ تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے بہت بڑی صُراحی مُنہ کے بل کھڑی کر دی گئی ہے۔

"کیپٹن، میں نے ابھی ابھی اس چٹان کو ہلتے ہُوئے دیکھا ہے۔ اِس کا نچلا حِصّہ اِتنا پتلا ہے کہ ہَوا تیز چلے تو ساری چٹان ڈولنے لگتی ہے۔ اگر یہ گر گئی تو ہم اِس کے نیچے آ کر یُوں پِس جائیں گے جیسے ہاتھی کے پاؤں کے تلے چیونٹی۔" ضرار نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

"میں نے بھی اسے ہلتے ہُوئے دیکھا ہے۔" ندیم نے کہا۔ "میرے خیال میں ہمیں اِتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں سینکڑوں سالوں کی بارشوں اور آندھیوں نے اِس کا پیندہ بہت پتلا کر دیا ہے۔ میرے خیال میں یہ کئی سال تک اور اِسی طرح رہے گی۔ خیر، چلو ہم اُوپر چلتے ہیں۔"

دونوں نے ایک بار پھر جھیل کی طرف مُڑ کر دیکھا۔ چند لمحے وُہ وہاں کھڑے رہے اور پھر باتیں کرتے ہُوئے آگے

چل پڑے۔

"یہ اڈّا جھیل کے نیچے ہے۔" ندیم نے کہا۔ "اِسے تباہ کرنے کا ایک ہی طریقہ میرے ذہن میں آیا ہے اور وُہ یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس بہت بڑا بم ہو تو جھیل میں دے ماریں جھیل کی تہہ میں سُوراخ ہو جائیں گے اور پانی اڈّے میں داخل ہو کر تمام مشینوں کو تباہ کر دے گا۔"

"آپ اڈّے کے بارے ہی میں سوچتے رہیں گے یا کسی اور چیز کا بھی خیال رکھیں گے؟" ضرار نے کہا۔

"مثلاً کس چیز کا؟" ندیم نے پُوچھا۔

"دیکھیے، یہ چٹان پھر ہلی ہے۔" ضرار بولا۔

ندیم نے بھی چٹان کو ہلتے ہُوئے دیکھ لیا تھا۔ وُہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وُہ بولا "چلو، اِس چٹان کو قریب سے جا کر دیکھیں۔"

"فائدہ"؟ ضرار نے پُوچھا۔

"تُم آؤ تو سہی۔" ندیم کا چہرہ خُوشی سے سُرخ ہو گیا تھا۔

"میری تو اِس ڈولتی چٹان کو دیکھ کر جان نکلی جاتی ہے اور آپ ہیں کہ خُوش ہو رہے ہیں۔" ضرار نے کہا۔

"ایک بات بتاؤ۔" ندیم بولا۔ "اگر یہ چٹان گر جائے تو بتاؤ کہاں جا کر ٹھہرے گی؟"

ضرار نے گردن گھما کر دیکھا اور کہنے لگا: "میرے خیال میں یہاں سے جھیل تک ڈھلان ہے اور راستے میں اور کوئی رُکاوٹ بھی نہیں۔ اِس لیے سو فی صد اِمکان ہے کہ یہاں سے لُڑھک کر سیدھی جھیل میں گرے گی۔"

"وہ مارا" ندیم نے چٹکی بجا کر کہا۔ "اب آؤ اِس چٹان کو قریب سے دیکھیں۔"

اُنھوں نے کئی چکّر کاٹے اور دس منٹ کے بعد وہ اُس چٹان کے قدموں میں تھے۔ ندیم بڑے غور سے چٹان کو دیکھ رہا تھا۔ جُوں جُوں وہ اُسے دیکھتا۔ تُوں تُوں خُوشی سے دیوانہ ہُوا جاتا۔

اچانک ندیم نے کہا۔ "ضرار، دیکھتے ہو یہ کیا ہے۔"

"چٹان کی بُنیاد میں بہت سے سُوراخ ہیں۔ یُوں معلُوم ہوتا ہے جیسے خرگوش یا اِسی قسم کے جانوروں نے سُرنگیں بنا رکھی ہیں۔" ضرار نے کہا۔

"بس یہی میں چاہتا تھا۔" ندیم بولا۔

ضرار کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اِس لیے وہ خاموش رہا۔ ندیم نے چند پتھر اکٹھے کیے اور خُوب غور سے چٹان کی بُنیاد کو دیکھنے کے بعد ایک جگہ پر رکھ دیے۔

"چلو اب ریڈیم لیں۔" ندیم نے زمین سے اُٹھتے ہُوئے

کہا۔

"چلیے۔" ضرار نے کہا۔ "مگر اِتنا وقت ضائع کرنے کا مطلب کیا ہے؟"

"یہ پھر بتاؤں گا۔" ندیم نے کہا۔

اُن کے سامنے کوہِ نُور تھا اور قدموں تلے نیلے رنگ کی زمین تھی۔ ہر جگہ ریڈیم موجود تھا مگر اُس کے ساتھ مٹّی اور دیگر کئی چیزیں مِلی ہُوئی تھیں۔ ندیم اور ضرار خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ ایک جگہ رُک کر اُنھوں نے زمین کھودنا چاہی مگر اُسی لمحے بجلی چمکی اور وہ ڈر کر ایک طرف ہو گئے اُن کے قریب ہی دو بَنتَنی اپنی زبان میں باتیں کرتے ہُوئے گزرے۔ ضرار نے بندُوق سیدھی کی۔

ندیم نے جلدی سے بندُوق پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہم گولی نہیں چلائیں گے۔ کوشش کرو کہ بغیر لڑائی کے ہی ہمارا مقصد پُورا ہو جائے۔"

ضرار نے بندُوق نیچی کر لی۔ دونوں آدمی دُور جا چکے تھے۔ ندیم اور ضرار چند قدم اور آگے بڑھے۔ یہاں زمین چار سیڑھیاں بنی ہُوئی تھیں اور اس کے بعد ایک بہت چوڑی چھت تھی۔ دونوں چھت پر آ گئے۔ وہاں اُنھیں ایک گڑھا نظر آیا۔ ندیم آگے بڑھا اُس نے جھانک کر دیکھا۔ کوئی آٹھ

فٹ گہرا کنواں تھا۔" میرے خیال میں یہاں اچھی قسم کا ریڈیم
مل سکتا ہے۔" ندیم نے کہا۔

ندیم گڑھے میں کود گیا اور چاقو نکال کر گڑھے میں لگے
ہوئے ایک پتھر کو کھرچنا شروع کر دیا۔ ضرار اوپر سے جھانک
رہا تھا۔ پندرہ منٹ گزر گئے۔ اچانک بجلی چمکی اور ہر چیز
صاف دکھائی دینے لگی۔ وہ دونوں تبتی کافی دور جا کر پھر
واپس مڑے۔ ضرار نے پھرتی سے گڑھے میں چھلانگ لگا دی
ندیم نے کہا۔ "تم کس لیے آئے ہو؟"

"اگر میں نہ آتا تو وہ لوگ مجھے دیکھ لیتے اور مقابلے
تک نوبت آ جاتی۔" ضرار نے آہستہ سے کہا۔

ندیم خاموش رہا۔ تھوڑی دیر میں تبتی گڑھے کے قریب
پہنچ چکے تھے۔ ندیم اور ضرار گڑھے کی تہہ میں بیٹھ گئے۔
تبتی کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ چلے گئے۔ ندیم کے
ساتھ ضرار بھی زور لگا کر کنویں کی دیوار سے پتھر نکالنے
کی کوشش کرنے لگا۔ دس منٹ اور گزر گئے۔ پتھر اب
باہر آ چکا تھا۔

"افسوس، اس میں بھی مٹی ملی ہوئی ہے۔" ضرار نے
کہا۔ "بہرحال کچھ نہ کچھ ریڈیم اس میں سے حاصل تو ہو گا۔"
یہ پتھر چار فٹ لمبا، چھ انچ موٹا اور چار انچ چوڑا

تھا۔ پتھر کیا تھا مستطیل نما ڈنڈا سا تھا۔

ندیم نے ضرار کے کندھے پر پاؤں رکھ کر ریڈیم اور رائفل
کنویں سے باہر رکھ دی اور پھر گڑھے سے باہر کود گیا۔ ایک
مرتبہ پھر بجلی چمکی مگر آس پاس کوئی شخص نظر نہ آیا۔ ندیم
نے ہاتھ پکڑ کر ضرار کو کنویں سے باہر نکالا۔ دونوں جلدی
جلدی راستہ طے کرتے ہوئے ڈگمگاتی چٹان کے قریب پہنچ گئے
پھر وہ مختلف موڑ مڑتے ہوئے اسی جگہ پر آ گئے — جہاں
شاہین کھڑا تھا۔ پلال اور چاچی بڑی بے چینی سے جہاز کے
قریب ٹہل رہے تھے۔

خونی مکھیاں

ضرار اور ندیم نے ذرا دُور ہی سے اپنے آنے کی اِطلاع دے دی کیوں کہ ڈر تھا کہیں اُنھیں دُشمن سمجھ کر آصف پھر ریوالور نہ نکال لے۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ ندیم نے قریب آ کر بلال سے کہا "کیا بات ہے، تُم پریشان دِکھائی دیتے ہو؟"

"آصف اور لالہ غنی پتا نہیں کہاں چلے گئے۔"

"کس وقت سے غائب ہیں؟" ندیم نے پُوچھا۔

"کوئی ایک گھنٹے سے۔" چاچی نے کہا۔

"بہت بُری بات ہوئی۔ تُم نے اُنھیں تلاش کیا ہوتا۔" ندیم نے کہا۔

"ہم نے اِرد گرد کی تمام جگہیں دیکھ ڈالیں اور آوازیں بھی دیں۔ سمجھ میں نہیں آتا اُنھیں زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔" بلال نے پریشان ہو کر کہا۔

ندیم گہری سوچ میں ڈُوب گیا۔ کچھ دیر کے بعد بولا۔ "ایک بات صاف ہے کہ تبتی اُنھیں ہلاک ہرگز نہیں کریں گے۔ وُہ ہمیں زندہ گرفتار کر کے ساری عُمر عذاب دینا چاہتے ہیں۔ اِس وقت ہم اُنھیں ڈھونڈنے کہاں جائیں؟ صُبح ہی کو کچھ ہو سکتا ہے۔ دو گھنٹے صبر کرو۔ یہ لو ریڈیم اور اِسے جہاز کے اندر رکھ دو۔" بلال ریڈیم لے کر جہاز کے اندر رکھنے چلا گیا۔

ندیم مُختلف باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ بلال، چاچی اور ضرار کو اُمید تھی کہ ندیم آصف اور غنی کو آزاد کرانے کا ضرور کوئی نہ کوئی طریقہ معلوم کر لے گا۔ دراصل ندیم کی ذہانت اور جُرأت پر اُنھیں اِتنا بھروسہ تھا کہ وُہ اُس کے ہوتے ہُوئے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ اُس کی موجُودگی میں سب بہادر بن جاتے تھے۔

دو گھنٹے گُزر گئے۔ صُبح ہو گئی۔ نیند اِن چاروں سے کوسوں دُور بھاگ چُکی تھی۔ سب پریشان تھے۔ راستے میں کسی شخص کے دوڑنے کی آواز آئی۔

"دیکھو کون ہے۔" ندیم نے ضرار سے کہا۔

ضرار بلند آواز سے چلّایا "کون ہے؟" مگر بھاگنے

والے نے کوئی جواب نہ دیا۔ ضرار پھر چلّایا: "بولو ورنہ گولی چلا دوں گا۔" اور یہ کہہ کر اُس نے فوراً بندوق تان لی۔

کمبل میں لپٹے ہُوئے دو آدمی اُن کی طرف بے تحاشا بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ضرار کی آواز سُن کر اگلا آدمی ٹھہر گیا اور دُور ہی سے چلّا کر بولا۔

"میں آصف ہُوں اور میرے ساتھ غنی لالہ ہیں۔ ہمارے سر پر خُونی مکھّیاں چکر کاٹ رہی ہیں۔ جلدی سے آگ جلا لو ورنہ یہ ہم سب کو ہلاک کر دیں گی۔"

ندیم، بلال، چاچی اور ضرار نے بڑی پھُرتی سے اپنے آس پاس گھاس کا دائرہ بنایا اور اُس کے اندر جا بیٹھے۔ ندیم نے ماچس جلائی اور گھاس جلنے لگی۔ تھوڑی دیر میں آصف اور عبدُالغنی بھی آ گئے۔ اُنھوں نے آگ کے دائرے میں داخل ہو کر کمبل اُتار دیے۔ خُونی مکھّیاں آگ دیکھ کر بھاگ گئیں۔

"کہاں تھے آپ لوگ؟" ندیم نے پُوچھا۔

"رات کے بارہ ایک بجے میں اور لالہ غنی پہرا دیتے وقت باتیں کر رہے تھے کہ اچانک لالہ غنی خاموش ہو گئے میں نے اُنھیں پُکارا تو وُہ زمین پر لیٹ گئے تھے۔" آصف نے کہا۔ "دراصل بات یہ ہُوئی کہ رات کے اندھیرے میں دو زنبتی، جو ہماری نظروں سے غائب تھے، ہمیں گرفتار کرنے

کا موقع ڈھونڈ رہے تھے۔ اندھیرے کی وجہ سے اُن کا نیلا بادل ہمیں نظر نہ آ سکا۔ پہلے تو ایک زنبتی نے پیچھے سے آ کر لالہ غنی کو گرفتار کیا اور پھر دُوسرے نے میرے مُنہ میں کپڑا ٹھونس کر ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ اِس طرح اِن دونوں نے ہمیں گرفتار کیا اور اڈّے کی طرف چل پڑے۔"

"میرے خیال میں،" ندیم بولا، "اب یہ لوگ پچّاس پچّاس یا سو دو سو کی تعداد میں ہمیں گرفتار کرنے نہیں آئیں گے کیوں کہ اِس طرح اُنھیں نُقصان ہوتا ہے۔ اب وُہ ایک وقت میں صِرف دو آدمیوں کو ہی بھیجتے ہیں۔"

"تمھارا خیال بالکل دُرست ہے۔" عبدُالغنی نے کہا۔

"خیر چھوڑیے اِس بحث کو۔ پھر کیا ہُوا؟" ضرار نے پُوچھا۔

"پھر اُنھوں نے ہمیں چنگ فرنگ کے سامنے پیش کیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اِنھیں جیل میں ڈال دیا جائے چُنانچہ ہم ایک بدبُودار کمرے میں بند کر دیے گئے۔ لالہ غنی کی زبانی مُجھے معلُوم ہُوا کہ یہ لوگ ایک گھنٹے کے بعد ہمیں عذاب دینے کے لیے ایک کُنویں میں پھینک دیں گے۔ اِس کُنویں میں لاکھوں اور کروڑوں سیاہ چیونٹے رہتے ہیں۔ جب کسی آدمی کو اِس کُنویں میں گرایا جاتا ہے تو وُہ اُس کا گوشت ہڈّیاں، کھال اور بال وغیرہ ہر چیز چٹ کر جاتے ہیں اور

آدمی کا نام و نشان تک نہیں چھوڑتے ۔ ہمیں موت سامنے نظر
آ رہی تھی ۔

اِتنے میں ایک تبتی آیا ۔ اُس نے چند لمحے لالہ غنی سے
باتیں کیں پھر ایک پُڑیا اُن کے ہاتھوں میں تھما کر واپس چلا
گیا ۔

میں نے لالہ غنی سے اس تبتی کے بارے میں پُوچھا تو
اُنھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ میں نے اِس کی جان بچائی تھی ۔
تب سے یہ میرا بھائی بن گیا ہے ۔ کہتا تھا جس طرح تُم نے
میری جان بچائی تھی اِسی طرح میں بھی تُمھاری جان بچاؤں گا
اُس نے مُجھے ایک پُڑیا دی ہے ۔ جس میں سفید پاؤڈر ہے
کہتا تھا کہ کُنوئیں کے بالکُل درمیان میں کُودنا کیوں کہ وہاں
ریت ہے اور اِس طرح تمُھیں چوٹ نہیں آئے گی ۔ دُوسری
بات یہ کہ کُنوئیں میں گرتے ہی سفید پاؤڈر ارد گرد بکھیر دینا
اِس پاؤڈر سے چیونٹے مر جائیں گے ۔

ایک گھنٹے کے بعد چار تبتی آئے اور ہمیں کُنوئیں کے
پاس لے گئے ۔ پہلے اُنھوں نے لالہ غنی کو کُنوئیں کی مُنڈیر پر
کھڑا کیا اور کُودنے کے لیے کہا ۔ لالہ غنی نے خُوب اچھّی طرح
اندازہ کرنے کے بعد کُنوئیں کے بالکُل بیچ میں چھلانگ لگا دی
نیچے گرتے ہی اُنھوں نے پاؤڈر چھڑک دیا ۔ ایک سیکنڈ کے

اندر اندر چیونٹے ہلاک ہو گئے ۔ پھر لالہ غنی دیوار سے لگ گئے
اِتنی دیر میں مَیں بھی مُنڈیر پر کھڑا ہو چُکا تھا میں نے بھی
آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی ۔ چاروں تبتی جا چُکے تھے ۔

چند منٹ تک ہم کُنوئیں میں پڑے رہے ۔ پھر وہی تبتی
لالہ غنی کا مُنہ بولا بھائی ، آیا ۔ اُس نے ایک رسّا مُنڈیر سے
کَس کر باندھ دیا اور اُس کا سِرا کُنوئیں میں لٹکا کر واپس چلا
گیا ۔ باری باری ہم دونوں اِس رسّے کی مدد سے کُنوئیں سے باہر
آ گئے ۔ ہم اب واپس اِسی جگہ آنا چاہتے تھے کہ ہمیں چند
تبتیوں نے دیکھ لیا ۔ اُن کے پاس خُوں خوار کُتّے تھے ۔ اُنھوں
نے ہمارے پیچھے کُتّے چھوڑ دیے ہم بھاگ کر ایک تنگ سی
گلی میں جا نکلے ۔ اِس گلی کا راستہ آگے سے بند تھا — کُتّے
ہمارے قریب آ چُکے تھے ۔ ہم حیران تھے کہ کیا کیا جائے ۔
اِتنے میں دائیں ہاتھ کے مکان کا دروازہ کھُلا ۔ ہم نے موقع
غنیمت جانا اور چھلانگ لگا کر دروازے میں داخل ہو گئے ۔ ہم
نے دروازہ بند کر لیا مگر کُتّے ہمارے اِتنے قریب پہنچ چُکے
تھے کہ ایک کُتّے کی گردن دروازے کے دونوں پٹوں کے
درمیان آ گئی ۔ ہم نے زور لگا کر دروازہ بند کر دیا اور اندر
کی طرف سے کُنڈی لگا لی ۔ کُتّا وہیں پھنس کر رہ گیا اور دم
گھُٹنے سے ہلاک ہو گیا ۔

"بعد میں ہمیں پتا چلا کہ دروازہ کھولنے والا ایک بُوڑھا
تبّتی تھا - جسے نیند کی حالت میں چلنے پھرنے کی عادت تھی -
وُہ اُس وقت سوتے سوتے اُٹھا تھا اور دروازے تک آ کر
اُسے کھولنے لگا تھا کہ عین اُسی وقت ہم وہاں پہنچ گئے -

"اس بُڈھے تبّتی نے آپ کو کچھ نہیں کہا ؟" بلال نے
پُوچھا -

"وُہ ہمیں کیا کہہ سکتا تھا - پھر وُہ تو سویا ہُوا تھا - خواب
میں چل رہا تھا - جب ہم اندر داخل ہُوئے اور دروازہ بند
کیا تو وُہ مکان کی سیڑھیوں میں ہی سو گیا -

ہم سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آ گئے - وہاں ہم نے دیکھا
کہ شیشے کے ایک بُہت بڑے ڈبّے میں دو مرتبان ہیں جن
میں زہر کے چھتّے لگے ہیں -"

"زہر کے چھتّے یا شہد کے چھتّے ؟ چاچی نے پُوچھا -

"زہر کے چھتّے ــــ سُنیئے تو ــــ" آصف نے کہا - "ان چھتّوں
میں شہد کی بجائے زہر کی مکھّیاں تھیں - یہ مکھّیاں دراصل اس
بوڑھے نے چنگ فرنگ کے حُکم سے پال رکھی تھیں - ان
مکھّیوں کا زہر انتہائی خطرناک ہوتا ہے اور ان کا کاٹا دُوسرا
سانس بھی نہیں لیتا -

"تمھیں اس کا کیسے پتا چلا ؟" ندیم نے پُوچھا -

"بات یہ ہُوئی -" آصف بولا - "کہ لالہ غنی کو ایک تجویز
سُوجھی - ہم چھت سے پھر نیچے آ گئے - بُوڑھا ابھی تک سیڑھیوں
میں لیٹا خواب میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا - لالہ غنی
نے اُس سے باتیں کرنا شرُوع کر دیں اور بُہت سی راز کی
باتیں معلُوم کر لیں - اسی سے ہمیں پتا چلا کہ یہ مکھّیاں آگ
سے ڈرتی ہیں - اسی بوڑھے کی زبانی معلُوم ہُوا کہ چنگ فرنگ کا
منصُوبہ ہے کہ جب وُہ ساری دُنیا کو تباہ کرنے کے لیے حملے
کرے گا تو موت کی شعاعوں کے علاوہ ان مکھّیوں سے بھی کام
لے گا -

"لالہ غنی نے بُڈھے سے پُوچھا کہ اگر یہ مکھّیاں کسی کو کاٹ
لیں تو اس کا علاج کیا ہے - بُڈھے نے بتایا کہ ان مکھّیوں
کے کاٹے کا علاج اس کے سوا دُنیا میں اور کسی کے پاس
نہیں - لالہ غنی کے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ برابر
والے کمرے میں ایک شیشی ہے جس میں وُہ پچاس برس
سے ان مکھّیوں کے جسم کا عرق نچوڑ کر جمع کرتا رہا ہے -
اس عرق کا ایک قطرہ لگا دینے سے ان مکھّیوں کا زہر بے کار
ہو جاتا ہے -"

"کہاں ہے وُہ شیشی ؟" ندیم نے پُوچھا -

"لالہ غنی کے پاس -" آصف بولا - "پھر ہم نے اس کمرے

میں سے دو کمبل اُٹھائے اور اپنے جسم کے اِرد گِرد اچھّی
طرح لپیٹ کر چھت پر آ گئے۔ ایک مرتبان میں نے اور
دُوسرا مرتبان لالہ غنی نے اُٹھا لیا۔ اِن کے اندر لاکھوں
مکّھیاں بند ہیں۔" یہ کہہ کر آصف نے مرتبان اُن کو دکھائے۔

آصف نے بات جاری رکھی۔ "پھر ہم چھت سے نیچے
آئے۔ اِتنی دیر میں نِنجی ہمارا پیچھا کرتے ہُوئے وہاں پہنچ
چُکے تھے اور اب دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔ جب بُوڑھے
نے دروازہ نہ کھولا تو وُہ دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے
بُوڑھا ابھی تک سیڑھیوں میں سویا ہُوا تھا۔ ہم ایک کمرے
میں چُھپے ہُوئے تھے۔ اندر آتے ہی اُنھوں نے بُوڑھے کے
ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔

تھوڑی ہی دیر میں وُہ تلاش کرتے ہُوئے اُس کمرے
میں آ گئے جہاں ہم دونوں کمبلوں میں لپٹے بیٹھے تھے۔ جب
وُہ ہمارے قریب پہنچے تو لالہ غنی نے اپنے مرتبان کا ڈھکّن
تھوڑا سا کھول دیا۔ اِس میں سے چند مکّھیاں بھنبھناتی ہُوئی
نکلیں اور اُن لوگوں پر ٹُوٹ پڑیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے
وُہ زمین پر تڑپ تڑپ کر مَر گئے۔ مرتے وقت پہلے تو
اُن کا جسم سُرخ ہُوا۔ پھر اُنھیں خُون کی قے آئی اور اُس
کے بعد وُہ ختم ہو گئے۔

ہم نے اپنے اُوپر کمبل ڈالے ہُوئے تھے اِس لیے بچ
گئے۔ یہ مکّھیاں کمرے میں سے نکل کر اِرد گِرد کے علاقے
میں پھیل گئیں اور اُنھوں نے سینکڑوں نِنجیوں کو ہلاک کر
دیا۔ اب ہم اُس مکان سے نکلے اور چُھپتے چُھپاتے واپس آ گئے۔"

"راستے میں آپ کو کوئی اور نِنجی نہیں ملا۔" بلال نے
پُوچھا۔

"چند ایک ملے مگر ہم ہر مرتبہ مرتبان سے ایک دو مکّھیاں
نکال دیتے تھے۔ یہاں سے تھوڑی دُور ہمارے پیچھے کوئی
ایک سو نِنجی بھاگے آ رہے تھے۔ ابھی ہم نے مرتبان میں
سے چند ایک ہی مکّھیاں نکالی تھیں کہ اِن لوگوں کی لاشیں
زمین پر تڑپنے لگیں۔ صِرف ایک شخص بچ سکا جو اُس وقت
سگار پی رہا تھا۔ اِن لوگوں کو ختم کرنے کے بعد یہ مکّھیاں
ہمارے پیچھے پڑ گئیں۔ ہم کمبل اوڑھے ہُوئے تھے۔ اِس لیے
بچ گئے۔ مگر اُنھوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ آپ نے
بروقت آگ جلا لی ورنہ آپ میں سے ایک آدھ کی موت ضرور
واقع ہو جاتی۔"

اڈّے کی تباہی

"خُدا کا شُکر ہے کہ آپ زندہ و سلامت آ گئے ہیں۔" ندیم نے آصف اور عبدُالغنی سے کہا۔ "لیکن اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تبّتیوں کے اڈّے کو تباہ کرنے کا منصُوبہ میں نے سوچ لیا ہے۔ پہلے میری باتیں اچھّی طرح سُن لیجیے اور اُس کے بعد کوئی سوال کیجیے۔"

"کڑڑڑ دھڑام۔" بجلی چمکی اور بادل گرجا۔ سب شاہین کے اندر جا بیٹھے۔ بارش تیز ہو گئی تھی۔ بجلی بار بار چمک رہی تھی اور بادل بہت گھرے تھے ہر طرف اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔

"بلال" ندیم نے کہا۔ "تُم میرے ساتھ آؤ اور جہاز کی ٹینکیوں میں پٹرول بھرو۔"

اُنھوں نے ٹینکیوں میں پٹرول بھرا اور خالی ڈرم باہر پھینک دیے۔ پھر اُنھوں نے انجنوں کے ایک ایک پُرزے

کو چیک کیا۔

اِن کاموں سے فارغ ہو کر ندیم نے کہا۔ "اب آپ میرا منصُوبہ سُنیے۔"

"ارشاد" چاچی نے مُسکرا کر کہا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے" ندیم نے کہا۔ "میں اور ضرار کوہِ نُور سے ہو کر آئے ہیں۔ وہاں صدیوں پُرانی اور لاکھوں ٹن وزنی ایک ایسی چٹان ہے جو نیچے سے بہت پتلی ہے مگر اُس کا اُوپر کا حصّہ بہت پھیلا ہُوا ہے۔ ذرا سی تیز ہَوا سے بھی یہ چٹان ہلنے لگتی ہے۔ اِس کے نچلے حصّے میں بہت سے سُوراخ ہیں شاید ان میں خرگوش یا چُوہے رہتے ہیں۔ اگر ہم کسی طرح اِن سُوراخوں میں بارود بھر دیں اور کچھ آس پاس بکھیر دیں تو مجھے سَو فی صد یقین ہے کہ پُوری چٹان لُڑھک کر ایک ہزار فٹ نیچے جھیل میں جا گرے گی۔ اِتنی بُلندی سے گرنے کی وجہ سے یہ جھیل کی تہہ یا دُوسرے لفظوں میں اڈّے کی چھت کو تباہ کر دے گی۔ اِس کا پانی مشینوں میں داخل ہو کر اُنھیں جام کر دے گا۔"

"اچھّا تو یہ بات تھی۔" ضرار نے بات مکمّل بھی نہ کی تھی کہ ندیم نے اُس کی بات کاٹ کر کہا۔

"سُنو، جب یہ چٹان جھیل میں گرے گی تو اِس کا پانی

سینکڑوں فٹ بلندی تک اُچھلے گا اور اِس سے آس پاس کے
علاقوں میں سیلاب آ جائے گا۔ ہو سکتا ہے پانی یہاں تک
بھی پہنچ جائے جہاں ہم اِس وقت ہیں۔ اِس لیے ہم جہاز کو
اِس جگہ سے ہٹا کر کسی اور جگہ لے جائیں گے۔ میں نے وہ
جگہ بھی چُن لی ہے۔"

"کون سی جگہ؟" بلال نے پوچھا۔

"کوہِ نور کے قریب ہی ایک چٹان پر چھت بنی ہوئی
ہے۔" ندیم نے کہا۔ "وہاں ہمارا جہاز بڑی آسانی سے کھڑا
ہو سکتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوہِ نور کا کیا کیا
جائے؟ تو اِس بارے میں آپ کو یہ سُن کر خوشی ہو گی —
جونہی لاکھوں ٹن وزنی چٹان اپنی جگہ سے ہلے گی کوہِ نور کی
بُنیادیں بھی ہل جائیں گی۔ اِس کی وجہ یہ ہے کوہِ نور کا اُوپر
کا حصّہ دائیں طرف جُھکا ہُوا ہے۔ اِس چٹان کے گِرنے سے
آس پاس کی زمین پر بھونچال سا آ جائے گا اور کوہِ نور بھی
گِر جائے گا۔

میرے سامنے سب سے مُشکل مسئلہ یہ تھا کہ جب چٹان
کے نیچے بارُود رکھ کر ہم اِسے اُڑائیں گے تو ہم اپنا بچاؤ کس
طرح کریں گے؟ خوش قسمتی سے اِس کا حل میرے ذہن میں
آ گیا ہے میں اور ضرار پٹرول کو ایک لمبی لکیر کی شکل میں

چٹان پر بکھرے ہُوئے بارُود سے لے کر کافی دُور تک لے
کھینچے چلے جائیں گے۔ پھر ہم دُور ہی سے پٹرول کو آگ
دکھائیں گے اور فوراً جہاز کو اُڑا لے جائیں گے۔"

سب بڑے دھیان سے ندیم کی باتیں سُن رہے تھے۔
بارش تھم چکی تھی مگر بادلوں کی وجہ سے اندھیرا چھایا ہُوا تھا۔
ندیم نے کہا، کام کرنے کا یہ بہترین وقت ہے۔ کیوں کہ
اِس وقت زیتنی گھروں میں گُھسے ہوں گے۔"

"آپ کا منصُوبہ تو دُرست ہے پر بارُود کہاں سے آئے
گی؟" آصف نے کہا۔

"آصف صاحب" ندیم نے کہا۔ "آپ کا خیال ہے کہ
بارُود لینے کے لیے ہمیں پاکستان جانا پڑے گا؟ ہم بیس
پچیّس کارتوس الگ رکھ کر باقی سب کارتوسوں کی بارُود
نکال لیں گے۔"

یہ سُنتے ہی سب لوگ کارتوسوں میں سے بارُود نکالنے
لگے۔ اچانک ضرار کی نظر باہر کی طرف اُٹھ گئی وہ گھبرا کر
کہنے لگا: "اُف میرے اللہ۔ وہ آ گئے۔ یہ دیکھو۔ ہزاروں
کی تعداد میں ہیں۔"

"نہیں" عبدُالغنی نے کہا۔ "یہ ہماری طرف نہیں آ رہے
ہیں۔ یہ کوہِ نور کے آس پاس بکھر جائیں گے اور تین دِن

اور تین رات تک خوب جشن منائیں گے - چوتھے دِن یہ پہلا حملہ کریں گے - جس سے سو سو میل تک تمام جاندار جل کر کوئلہ ہو جائیں گے - اِس کے بعد یہ نئے سٹیشن قائم کریں گے اور پھر اِن جگہوں سے حملے کریں گے - اِسی طرح یہ ہر چیز کو تباہ و برباد کرتے ہُوئے ساری دُنیا پر چھا جائیں گے - اِن کی تیاری مکمل ہو چکی ہے - اِسی لیے یہ لوگ جشن منانے جا رہے ہیں - ایک بات مجھے آج یاد آتی ہے - کوہِ نُور اندر سے کھوکھلا ہے - اُس کے اندر اِن لوگوں نے ایک بہت بڑا ہال بنایا ہے - اِس ہال میں سے ایک سُرنگ نیچے کی طرف اڈّے میں جا نکلتی ہے - یہ لوگ اِس سُرنگ کے ذریعے ہی آتے جاتے ہیں -"

ندیم اُچھل پڑا اور بولا - "اِس کا مطلب یہ ہُوا کہ جب اڈّا تباہ ہوگا تو اِس میں سے اُٹھنے والی بھاپ اور حرارت اِس سُرنگ کے ذریعہ کوہِ نُور کے ہال میں داخل ہو کر وہاں بہت سی چیزیں تباہ کر دے گی -"

"یقیناً" عبدُالغنی نے کہا -

اِس طرح تو ہمارا کام اور بھی آسان ہو گیا ہے - ہمارے پاس اِتنی بارُود نہیں تھی کہ کوہ نُور کے نیچے بھی ڈال سکتے بلال ، اب تُم جہاز سٹارٹ کر دو - اِنھیں کوہِ نُور تک پہنچنے

کے لیے کم از کم ایک گھنٹا لگے گا - میں نے کوہ نُور کے قریب ہی ایک چٹان دیکھی ہے - اگر تُم ہوشیاری سے کام لو تو وہاں جہاز کو آسانی سے اُتار سکتے ہو -"

بلال نے انجن سٹارٹ کیا اور پہاڑیوں اور چٹانوں سے بُلند ہو کر بچتا بچاتا کوہ نُور کے قریب چکّر کاٹنے لگا - ندیم نے ایک جگہ اِشارہ کیا اور بلال نے جہاز وہاں اُتار لیا -

"ضرار ، تُم میرے ساتھ آؤ - ہم اِس ڈولتی چٹان کے نیچے بارُود ڈالیں گے -" ندیم نے کہا -

"پٹرول تو نکالا ہی نہیں" بلال نے کہا -

"اوہ افراتفری میں بُھول ہی گئے - بلال ، تُم میرے ساتھ آؤ -" اُنھوں نے ٹینکی سے ایک دو گیلن پٹرول نکال لیا -

"میرے خیال میں" عبدُالغنی بولے "اُنھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے - دیکھو وُہ پہاڑیوں اور ٹیلوں کو پار کر رہے ہیں -"

"ہاں" ندیم نے قدرے پریشان ہو کر کہا - اچانک بجلی اور بادل گرجا - اِنھیں بیس منٹ ہو گئے تھے چٹان پر جہاز کھڑا کیے ہُوئے - ندیم بار بار "جلدی کرو - جلدی کرو" کے الفاظ دُہرا رہا تھا - بادل گرج رہے تھے - اچانک بجلی چمکی اور ندیم نے دیکھا کہ پانچ سات تبّتی جہاز پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں - ایک تبّتی تو کھڑکی کے پاس پہنچ چُکا تھا -

ندیم نے رائفل اُٹھائی اور فائر کرنا چاہا مگر اس میں گولی نہ
تھی۔ ریوالور اور بندوق بھی خالی تھے۔

تبّتی بڑی تیزی سے بھاگتے ہوئے کوہِ نور تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جہاز کی طرف آنے والا تبّتی اب کھڑکی کھول کر جہاز کے اندر کود گیا تھا۔ عبدالغنی، آصف اور چاچی جہاز کے پچھلے حصّے میں تھے۔ وہ چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ ندیم نے رائفل اُٹھائی اور اس کا دستہ تبّتی کے سر پر مارنے کی کوشش کی مگر وار خالی گیا۔ ندیم نے رائفل پھینک دی۔ اور اب دونوں گُتھم گُتھا ہو گئے۔ ضرار نے بڑی پھرتی سے اپنی بندوق اُٹھائی۔ ایک اور تبّتی کھڑکی کھول کر داخل ہونے ہی لگا تھا کہ ضرار کی بندوق کا دستہ اُس کے چہرے پر لگا۔ پھر دُوسری اور پھر تیسری ضرب اُس کے ہاتھوں پر لگی۔ وہ تیورا کر زمین پر جا گرا۔ اُدھر ندیم اور وہ تبّتی آپس میں گُتھم گُتھا تھے۔ بلال کو حکم تھا کہ وہ کیبن سے باہر نہ نکلے۔ ضرار بھوکے شیر کی طرح تبّتی پر جھپٹا۔ مگر ندیم نے چلّا کر کہا ـــ
"ضرار، تُم کھڑکی کا خیال رکھو۔"

دونوں ایک دُوسرے کو پچھاڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آصف آگے بڑھا تو ندیم نے اُسے بھی روک دیا۔
"وہیں رہو۔ میں اکیلا نپٹوں گا۔" تبّتی نے جاپانی کُشتی کا

داؤ مارا اور ندیم زمین پر گر پڑا۔ اُس کے ساتھ ہی وہ ندیم کی چھاتی پر کُودا مگر ندیم نے ایک دم اپنے آپ کو پرے کر لیا۔ تبّتی زور کے ساتھ جہاز کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اِسی اثنا میں ندیم کھڑا ہو چُکا تھا۔ اُس نے بجلی کی سی تیزی سے تبّتی کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیا اور وہ درد سے چیخنے لگا۔ ساتھ ہی ندیم نے اپنا دایاں پاؤں اُس کے بائیں پاؤں پر مارا تو وہ تیورا کر گرا۔ ندیم اس کی چھاتی پر بیٹھ گیا اور دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلا دبانے لگا۔ دو ہی منٹ میں وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

اچانک کھڑکی سے دو تبّتی اندر کُودنے لگے۔
"ضرار، تُم پیچھے ہٹ جاؤ" ندیم چلّایا۔

ضرار ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ ندیم نے کمال پھرتی سے مُردہ تبّتی کو ہاتھوں پر اُٹھایا اور کھڑکی میں کھڑے دونوں آدمیوں پر دے مارا۔ وہ دونوں مُنہ کے بل زمین پر گرے۔

ندیم نے گہرا سانس بھرا اور پیشانی سے پسینہ پُونچھا۔ اب کوئی تبّتی جہاز پر چڑھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اچانک جہاز زور زور سے ہچکولے کھانے لگا۔ بیسیوں تبّتی اس کو دھکیل کر چھت کے آخری سرے تک لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُدھر تبّتیوں کا ہجوم پچاس ساٹھ گز ہی دُور تھا۔

"بلال، انجن سٹارٹ کر دو۔ اگر یہ لوگ چٹان کے سرے تک اِسے لے گئے تو ہم ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں جا گریں گے۔" ندیم نے چلّا کر کہا۔

بلال نے جہاز چلانے کی کوشش کی مگر گھرر گھرر کی آوازیں آنے لگیں۔ اُس نے بار بار اِنجن سٹارٹ کیا مگر وُہ جام ہو چکے تھے۔

"اب جہاز نہیں چلے گا۔" عبدُالغنی نے کہا۔ "دافعِ برق پانی کا اثر ختم ہو چکا ہے۔"

اِتنے میں پھر بادل گرجا اور بجلی چمکی۔ جہاز کے گرد ہزاروں آدمی جمع ہو چکے تھے۔ جہاز آہستہ آہستہ چٹان کے سرے تک دھکیلا جا رہا تھا۔ اب چٹان مُشکل سے بیس فُٹ دُور تھی۔ بلال نے بریک لگانے کی کوشش کی مگر وُہ بھی جام ہو چکے تھے۔

اب اِن کو ایک ہی وقت میں کئی مُشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ چند فُٹ پرے موت کے کھڈ تھے اور نیچے ہزاروں دُشمن۔ جہاز سٹارٹ نہیں ہو رہا تھا اور ہتھیار بھی کام نہیں کر رہے تھے۔ سب پریشان تھے۔

"لیٹ جائیے۔ کمبل یا کپڑا اوڑھ لیجیے۔" اچانک آصف چلّایا۔

"کیا بات ہے؟" ندیم نے زمین پر لیٹتے ہُوئے کہا۔

"خُونی مکھی۔ یہ رہی۔ وُہ گئی۔" آصف بولا۔

خُونی مکھی کا نام سُن کر سب کے چہرے پیلے پڑ گئے۔ دراصل جہاز کے ہلنے جُلنے سے مرتبان میں سے ایک خُونی مکھی باہر نکل گئی تھی۔

عبدُالغنی، بجاجی اور آصف نے اپنے اُوپر خیمے کا کپڑا ڈال لیا تھا۔ بلال کیبن میں تھا۔ اُسے کہہ دیا تھا کہ وُہ باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ جہاز میں ایک خُونی مکھی چکّر کاٹ رہی ہے۔ ندیم اور فرّار نے کمبل اوڑھ لیے تھے۔ اچانک ندیم کو ماچس جلانے کا خیال آیا۔ لیکن دُوسرے ہی لمحے وُہ یہ سوچ کر لرز گیا کہ جہاز میں پٹرول اور بارُود پڑا ہے۔ مکھی کے ساتھ وُہ بھی بھک سے اُڑ جائیں گے۔ مکھی چکر کاٹتی رہی۔ سب دم سادھے لیٹے رہے۔

"کُچھ کرنا ہوگا۔ ورنہ جہاز چٹان سے نیچے گرا تو ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔" ندیم نے سوچا اور پھر جیب سے ماچس نکال لی۔ پھر اچھی طرح کمبل لپیٹ کر اُس نے کھڑکی کا دروازہ کھول دیا۔ مکھی اُس کے قریب پہنچ گئی۔ ندیم نے تیلی اپنے چہرے کے قریب کی اور پھُونک مارنے کے لیے مُنہ میں ہَوا بھر لی۔ "شرررر" اِدھر ماچس کی تیلی سے

شعلہ نکلا اور اُدھر ندیم نے طُوفان کی سی تیزی سے پھُونک مار
کر اُسے بُجھا دیا۔ خُونی مکھی بجلی کی سی تیزی سے کھڑکی سے
باہر نکل گئی۔ ندیم نے فوراً کھڑکی بند کر لی اور کمبل ذرا سرکا
کر آصف کی طرف بڑھا۔ اُس کے ذہن میں ایک عجیب ترکیب
آئی تھی۔

"آصف، خیمے سے مُنہ نکالو۔ مکھی باہر جا چُکی ہے۔ مرتبان
کہاں ہے؟ جلدی سے دو۔ ہم تباہی کے کنارے پر پہنچ
چُکے ہیں۔"

آصف نے مرتبان ندیم کو دیتے ہُوئے سہم کر کہا۔ "کیپٹن
کیا کرنے لگے ہو؟"

ندیم مرتبان لے کر کھڑکی کے پاس گیا۔ کھڑکی کھُلی تھی
جہاز کو زور زور سے جھٹکے لگ رہے تھے۔

"میں مرتبان کھولنے لگا ہُوں۔ اپنے جسم پر اچھی طرح
کپڑے لپیٹ لو۔" ندیم نے چلّا کر کہا اور پھُرتی سے کمبل اوڑھ
کر مرتبان کو کھڑکی میں سے ایک پتھّر پر دے مارا۔ چھن
کی آواز سے مرتبان ٹُوٹ گیا۔ ندیم نے فوراً کھڑکی بند کر لی۔

مرتبان ٹُوٹتے ہی ہزاروں مکھّیاں اِدھر اُدھر پھیل گئیں۔
اُوپر بادل کی گرج تھی اور نیچے مکھّیاں تباہی مچا رہی تھیں۔
اب جہاز کو جھٹکے نہیں لگ رہے تھے۔ جھٹکے لگانے والے

ہی ختم ہو چُکے تھے۔ چیخ و پُکار اور بھاگ دوڑ کی آوازیں جہاز
کے اندر آ رہی تھیں۔

ہزاروں آدمیوں کی لاشیں اِدھر اُدھر بکھر گئی تھیں۔ کچھ
واپس بھاگ رہے تھے۔ دو منٹ کے بعد ہر طرف قبرستان
کی سی خاموشی تھی۔

"غنی لالہ، دافعِ برق پانی کے بارے میں سوچیے ورنہ
پاکستان پہنچنا نامُمکن ہے۔" ندیم بولا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد عبدُالغنی نے کہا۔ "مجھے پتا نہیں
وُہ کہاں ملے گا۔ سامنے کوہِ نُور ہے۔ اِس کے ہال میں تلاش
کرتے ہیں۔"

ندیم مان گیا۔ دونوں نے کمبل لپیٹے اور جہاز سے باہر نکل
آئے۔ اب وُہ کوہِ نُور میں داخل ہو چُکے تھے۔ راستے میں
ہر طرف لاشیں بکھری ہُوئی تھیں۔ کوہِ نُور کے اندر بھی لاشیں
پڑی ہُوئی تھیں۔ دونوں سیڑھیاں اُترتے ہُوئے ہال میں پہنچے
وہاں ہزاروں ڈرم اور مُختلف قسم کی مشینیں تھیں۔ عبدُالغنی
ڈرموں پر لکھی ہُوئی تحریریں پڑھتے ہُوئے آگے بڑھ رہے
تھے۔ کوہِ نُور کے اندر کافی روشنی تھی۔ عبدُالغنی نے ایک
ڈرم کی طرف اُنگلی سے اِشارہ کیا۔ "اِس میں دافعِ برق پانی
ہے۔"

ندیم نے ڈرم اُٹھا کر دیکھا۔ کافی وزنی تھا۔ دونوں اُسے گھسیٹتے ہُوئے سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اب وُہ باہر آ چُکے تھے۔ ندیم نے جھیل کی طرف دیکھا تو ہزاروں تبتّی مشعلیں لیے کوہِ نُور کی طرف آ رہے تھے۔ ندیم نے زور لگا کر ڈرم کو اُٹھا لیا اور جہاز کی طرف بھاگنے لگا۔ اب وُہ جہاز کے نیچے کھڑا تھا۔ بلال اور ضرّار نے ڈرم اُوپر کھینچ لیا۔

"تُم اور بلال دونوں انجن پر پانی ملو۔ مُجھے بارُود دے دو۔ غنی لالہ آپ سب اُوپر بیٹھیں۔ فالتُو چیزیں باہر پھینک دیں" ندیم بولا۔

ضرّار اور بلال جہاز کے انجنوں پر پانی ملنے لگے۔ چاچی آصف اور عبدُالغنی نے خیمہ اور فالتُو چیزیں باہر پھینک دی تھیں۔ ندیم بارُود کو ڈولتی چٹان کے سُوراخوں میں بھر رہا تھا۔ اب تبتّی پچّاس قدم کے فاصلے پر تھے۔ ندیم نے پٹرول کا ڈبّا پکڑا اور بارُود پر چھڑکنے کے بعد باقی پٹرول اِدھر اُدھر بکھیر دیا۔ اب تبتّی بیس قدم دُور تھے۔ وُہ چلّاتے آ رہے تھے۔ ساری وادی اِن سے بھری ہُوئی تھی۔

ندیم بڑی پھُرتی سے کام کر رہا تھا۔ اُس کے بال بکھر کر پیشانی پر آ گئے تھے اور جسم پسینے میں شرابور ہو رہا تھا ندیم تھکن محسُوس کر رہا تھا۔ وُہ بھاگ کر جہاز کے پاس آیا۔

ضرّار اور آصف نے کھڑکی میں سے اُس کے ہاتھ پکڑے اور سہارا دے کر جہاز کے اندر لے گئے۔

شاہین میں داخل ہوتے ہی ندیم نے پہلا سوال کیا "کیا انجنوں پر پانی مل دیا گیا ہے۔؟"

"ہاں کیپٹن" ضرّار نے کہا۔

"بس سٹارٹ کر دو" ندیم نے حُکم دیا۔

جہاز چٹان کے کنارے سے صرف دو فٹ پرے کھڑا تھا۔ ایک منٹ کی دیر اور ہوتی تو تبتّی اِسے نیچے کھڈ میں گرا چُکے ہوتے۔ سب نے خُدا کا شُکر ادا کیا۔

اُدھر جلتی ہوئی مشعلیں لیے تبتّی اب ڈولتی چٹان سے صرف پندرہ بیس فٹ دُور تھے۔

بلال نے انجن سٹارٹ کر دیے اور بڑی پھُرتی سے جہاز کو چند گز پیچھے لے گیا۔ پھر اُس نے انجن تیز کر کے جہاز آگے کی طرف دوڑا دیا۔

جہاز چٹان کی سطح سے بُلند ہو گیا۔ اُسی لمحے تبتّی ڈولتی چٹان کے قریب پہنچ گئے تھے۔ پٹرول نے آگ پکڑ لی اور بارُود کو آگ لگتے ہی ایک دھماکہ ہُوا۔ زبردست دھماکے سے چٹان ٹُوٹ کر جھیل کی جانب لُڑھکنے لگی۔ سینکڑوں تبتّی اِس کے نیچے پِس کر رہ گئے۔ جہاز فضا میں

بُلند ہو رہا تھا۔

"بلال" ندیم نے کہا۔" جہاز کو کوہِ نُور سے زیادہ سے زیادہ دُور لے جاؤ۔"

بلال نے شاہین کا رُخ اُوپر کی طرف موڑ دیا اور رفتار تیز کر دی۔ اب اِن سے تقریباً پندرہ سو فٹ نیچے جھیل تھی۔ ندیم نے مکھیوں کا دُوسرا ڈبّا لیا اور کھڑکی کھول کر تتیّوں پر پھینک دیا۔

اچانک ایک زور دار دھماکہ ہُوا۔ چٹان جھیل میں گر کر اُس کی تہہ توڑ چکی تھی۔ پانی اڈّے میں داخل ہو کر مشینوں کو تباہ کر رہا تھا۔ کئی مشینوں کے پُرزے ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

"تُم نے ایسا نظارہ زندگی میں کبھی نہ دیکھا ہو گا۔" ندیم نے بلال سے کہا۔

"ہاں کیپٹن" بلال نے کہا۔

تھوڑی دیر تک فضا میں چکّر لگانے کے بعد وُہ سامنے کی طرف جانے لگے۔ یکایک ایک اور زبردست دھماکا ہُوا اور کوہِ نُور نیچے بیٹھ گیا۔

"آپ نے بھی ایسا نظارہ کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔" بلال نے کہا۔

"ہاں بلال" ندیم نے مُسکرا کر کہا اور بلال کے پاس آ بیٹھا۔" ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"معلُوم نہیں" بلال نے کہا۔

"ہمارے پاس اِتنا پٹرول نہیں کہ یُونہی اِدھر اُدھر گھُومتے رہیں" ندیم نے کہا۔

یہ کہہ کر اُس نے جیب سے قُطب نُما نکالا مگر اُس کی سُوئیاں کام نہیں کر رہی تھیں۔ اُس نے اُسے جھٹکے دیے۔ مگر سُوئیاں ویسی کی ویسی جام رہیں۔ ندیم نے بلال سے کہا کہ شاہین کو کسی کھُلی جگہ پر اُتارو۔ جب تک قُطب نما ٹھیک نہیں ہو گا۔ آگے جانا خطرناک ہے۔

بلال نے ایک میدان میں جہاز اُتار لیا۔ سب لوگ جہاز سے نکل کر کھُلی فضا میں ٹہلنے لگے۔ ندیم قُطب نما ہاتھ میں لیے باہر نکل آیا تھا۔ وُہ جہاز سے جِتنا دُور ہوتا گیا۔ قُطب نما اُتنا ہی اچھا کام کرنے لگا۔

"میری سمجھ میں بات آ گئی ہے۔" ندیم نے بلال سے کہا۔" دراصل ہمارے جہاز میں ریڈیم موجود ہے۔ اُس کی وجہ سے قُطب نُما کی سُوئیاں کام نہیں کر رہیں۔"

"اب کیا کِیا جائے؟" چاچی نے پُوچھا۔

تھوڑی دیر تک سب سوچتے رہے۔ آخر ندیم کو ایک

تجویز سوجھی۔ "میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے۔ اگر ہم ریشمی رسّی سے ریڈیم کی سُلاخ کو باندھ کر اس کو جہاز کی دُم سے لٹکا دیں تو اِس طرح ہم ریڈیم بھی لے جا سکیں گے اور قُطب نُما بھی کام کرنے لگے گا۔"

ندیم کی تجویز مان لی گئی۔ ریڈیم کو رسّی سے اچھّی طرح باندھ کر جہاز کی دُم میں لٹکا دیا گیا اور پھر چند گھنٹے بعد وُہ چٹاگانگ کے ہوائی اڈّے پر کھڑے تھے۔

ہوائی اڈّے کا مینجر ناراض ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا آپ اِتنے دِن بغیر اِطّلاع کے کہاں چلے گئے تھے۔ ندیم نے کہا کہ قُطب نُما راستے میں خراب ہو گیا تھا۔ اِس لیے ہمیں ایک وادی میں قیام کرنا پڑا۔ مینجر نے کہا۔ کہ ہم نے آپ لوگوں کی تلاش میں چھ جہاز دو دِن پہلے روانہ کیے تھے۔ اُنھوں نے آپ کو ہر جگہ ڈھونڈا مگر آپ کہیں نہیں ملے۔ خُدا کا شُکر ہے کہ اب آپ زِندہ سلامت آ گئے۔

وطن میں

سب لوگ ندیم کے بنگلے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

"غنی لالہ۔ خوچے امارا خواہش ہے کہ اب آپ امارا شہر راول پنڈی میں امارا ساتھ ہی رہے۔ آپ لوگ کا کیا خیال ہے؟" ندیم نے پٹھانوں کے لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔

"امارا کوئی بال باچہ ناہیں ہے۔ ہم تُمھارا ساتھ رہنے کو تیار ہے۔" عبدُالغنی نے بھی اُسی طرح جواب دِیا۔ سب کھِل کھلا کر ہنس پڑے۔

دُوسرے دِن وُہ پشاور گئے۔ تین چار روز وہاں قیام کیا عبدُالغنی کے بُہت سے رشتہ دار مر چُکے تھے۔ اُن کا مکان آدھا گر چُکا تھا۔ کُچھ دوست ملے جو اب بُہت بُوڑھے ہو چُکے تھے۔ عبدُالغنی کا وہاں دِل نہ لگا۔ جلد ہی وُہ راول پنڈی چلے آئے اور ندیم کے ہاں ہی رہنے لگے۔ ایک دِن سب

لوگ "جنت نگاہ" کے باغیچے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔
"بھئی آصف صاحب" ندیم نے کہا۔ "اس ریڈیم کا کیا
بنا؟"
"کیپٹن" آصف نے کہا "وہ میں نے ٹیسٹ کرانے
کے لیے ایک لیباریٹری میں بھیجا تھا۔ آج رپورٹ ملی ہے
کہ اس میں صرف چھ سات تولے ہی ریڈیم ہے۔ باقی مٹی
اور پتھر ہے۔ یہ سن کر سب کے چہرے لٹک گئے۔
"صرف چھ سات تولے؟" ندیم نے کہا۔
"جی ہاں" آصف نے کہا۔ "لیکن آپ کو معلوم ہے
اس کی کتنی قیمت ہے؟ کم از کم پچیس تیس لاکھ روپے۔"
"اگر مجھے پتا ہوتا تو میں ایسی کئی سلاخیں وہاں سے لے
آتا۔" ندیم نے کہا۔ "خیر اب آپ اس ریڈیم کا کیا کریں
گے؟"
آصف نے جواب دیا۔ "میں اسے ملک کے تمام ہسپتالوں
میں بانٹ دوں گا۔ یہ ہماری ایک بہت بڑی قومی خدمت
ہو گی۔"
"لالہ غنی کے واسطے ایک بنگلا خریدنے کے لیے میں نے
ایجنٹ سے کہہ دیا ہے کیپٹن، آپ سب حضرات شاہین
کے مالک ہیں۔ آج سے یہ آپ سب کا ہے۔"

"کیوں ضرار؟" ندیم نے پوچھا۔
"ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔" ضرار نے جواب دیا۔
"بلال تمھارا کیا خیال ہے؟" ندیم نے پوچھا۔
"میں آپ کے ساتھ ہوں۔" بلال بولا۔